جہانِ غالب
20
ga

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:10 شمارہ۔20

نگراں

پروفیسر شمیم حنفی

مدیر

ڈاکٹر عقیل احمد

غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی

جہانِ غالب

یادگار حکیم عبدالحمیدؒ

جلد:10 شمارہ:20 جون 2015 تا نومبر 2015

قیمت فی شمارہ:-/20 روپے

قیمت سالانہ:-/40 روپے

ڈاک سے: -/50 روپے

کمپوزنگ: بشریٰ بیگم

طابع و ناشر

ڈاکٹر عقیل احمد

سکریٹری: غالب اکیڈمی

بستی حضرت نظام الدین، نئی دہلی۔110013

فون نمبر:9868221198, 24351098

ای میل:ghalibacademy@rediffmail.com

ویب سائٹ:www.ghalibacademy.org

ISSN -2349-0225

پرنٹر، پبلشر ڈاکٹر عقیل احمد نے غالب اکیڈمی کی طرف سے شیروانی آرٹ پرنٹرس 1480 گلی حکیم اجمل خاں، بلیماران، نئی دہلی سے چھپوا کر غالب اکیڈمی 168/1 بستی حضرت نظام الدین نئی دہلی 13 سے شائع کیا۔ ایڈیٹر: عقیل احمد

فہرست

اس شمارے میں

جہان غالب کا بیسواں شمارہ پیش خدمت ہے۔ دیگر شماروں کی طرح اس شمارے میں بھی بیشتر مضامین اکیڈمی کے پروگراموں میں پڑھے گئے مقالات ہی ہیں لیکن ان میں تنوع پہلے سے زیادہ ہے۔ اکیڈمی اب مرزا غالب کے یوم ولادت اور یوم وفات کے جلسوں کے علاوہ اور بہت سے سیمینار و لیکچر کا انعقاد کرتی ہے۔ شرح دیوان مومن سیمینار قومی کونسل کے اشتراک سے اور شبلی نعمانی پر اکیڈمی نے اپنے وسائل سے کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا ان سیمیناروں میں پڑھے گئے بعض مقالے پیش خدمت ہیں۔

پہلا مقالہ پروفیسر نصیر احمد خاں کا مومن کی غزل کے اسالیب پر ہے۔ پروفیسر نصیر احمد خاں ماہر اسلوبیات بھی ہیں اور ماہر لسانیات بھی اسی زاویہ سے انھوں نے مومن کی غزلوں کا مطالعہ پیش کیا جسے سیمینار میں بہت پسند کیا گیا۔ انھوں نے اردو شاعری کے بارہ اسالیب بیان کئے اور مومن کے اسلوب کو وقت پسند گوئی سے تعبیر کیا۔ دوسرا مضمون ڈاکٹر خالد علوی کا سردار جعفری کی غالب شناسی ہے یہ وہ مضمون ہے جسے انھوں نے سردار جعفری کی پیدائش کے سو سال پورے ہونے پر ایک جلسے میں پڑھا تھا۔ جس میں انھوں نے سردار جعفری کی غالب شناسی پر ان کے مختلف مضامین اور ان کے مرتب کردہ دیوان غالب کے حوالے سے روشنی ڈالی تھی۔ اسے بھی اس شمارے میں شامل کیا جا رہا ہے۔ تیسرا مضمون مومن کی غزل کعبۂ معنی سینئر صحافی ریاض قدوائی کا ہے جو انھوں نے کل ہند سیمینار شرح دیوان مومن میں پڑھا تھا جس میں مومن کی غزلوں کے مفہوم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ڈاکٹر تبسم شاداب نے اردو کے اہم ادیبوں کی خطوط نگاری کا خاص مطالعہ کیا ہے۔ انھوں نے شبلی نعمانی کی خطوط نگاری کے عنوان سے مقالہ تحریر کر کے جہان غالب کے لیے بھیجا ان کا وہ مضمون اس شمارے میں شامل ہے۔

ڈاکٹر حنا آفرین مرزا غالب کے یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے یوم تاسیس کے موقع پر فروری میں منعقدہ سیمینار میں غالب اور نئی غزل کی روایت کے عنوان سے بہت پر مغز مقالہ پڑھا تھا جس میں انھوں نے کہا تھا کہ نئی غزل کا مطالعہ کرتے وقت ہم غالب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اسی سیمینار میں ڈاکٹر واحد نظیر نے عہد حاضر میں غالب کی معنویت کے عنوان سے مقالہ پڑھا تھا دونوں مضامین اس شمارے میں شامل ہیں۔

شرح دیوان مومن سیمینار میں مشہور نو جوان صحافی سید عنین علی حق اور محمد رضا فراز نے صحافتی مصروفیات سے کچھ وقت نکال کر مقالے پیش کیے۔ دونوں مقالے شامل اشاعت ہیں۔ شیخ اکرام کی کتاب غالب نامہ پر احمد علی جوہر کا مضمون بھی اس شمارے میں شامل ہے۔

گزشتہ ششماہی میں غالب اکیڈمی سے وابستہ اہم شخصیات ہم سے جدا ہو گئیں۔ مرحوم خواجہ حسن ثانی نظامی صاحب نے 15/مارچ کو اس دار فانی کو خیر آباد کہا اور مرحوم عبد المعید صاحب 19/مارچ کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اللہ سے دعا ہے کہ مرحومین کو جنت الفردوس عطا فرمائے۔ خواجہ صاحب اکیڈمی کے دس سال تک صدر رہے اور ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن انڈیا کے صدر عبد المعید صاحب اکیڈمی کی سرپرستی زندگی بھر فرماتے رہے۔ دونوں بزرگوں کے رخصت ہو جانے کا غم کسی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔

✿✿✿
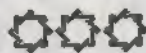
پروفیسر نصیر احمد خاں

اردو شاعری کے اسالیب میں مومن کی قدر

حکیم مومن خاں مومنؔ نے غزل، مثنوی، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ اور رباعی میں شاعری کی ہے۔ لیکن ان کا میدان غزل ہے۔ غزل کی پوری روایت ان کے کلام میں موجود ہے۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر کی شاگردی اختیار کی لیکن بعد میں اپنی راہ خود بنائی۔ وہ جمال پرست تھے۔ پیکر تراشی کے دلنواز نمونے ان کے یہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان کے کلام میں اپنے ہم عصروں کے مقابلے میں ادابندی اور اور محاورہ بندی زیادہ ہے۔

مومن زندہ دل، خوش طبع اور عاشق مزاج انسان تھے۔ ان کے یہاں فحاشی اور عریانی کی جگہ شائستگی ہے جس کی وجہ معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ وہ اپنے وقت کے مشہور صوفی شاہ عبدالعزیز کے درس میں شریک رہے ہیں. جنھوں نے پیدائش کے وقت کان میں نہ صرف اذان دی تھی بلکہ مومن نام بھی تجویز کیا تھا۔ مومن خوددار، انانیت پسند اور سلیم النفس انسان تھے۔ انھیں نازک خیال، مضمون آفریں اور دقت پسند شاعر کہا جاتا ہے۔ وہ تغزل، مکرِ شاعرانہ، داخلیت، ندرت اسلوب اور پیچیدہ بیان کے شاعر کہے جاتے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام میں مختلف علوم کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں اور مروجہ الفاظ کو نئے پیمانوں میں ڈھال کرنت نئے معنی مراد لیے ہیں۔ مومن نے اپنی فکر کا دائرہ عشق و محبت اور معاملات عشق تک محدود رکھا ہے۔ وہ رعایت لفظی کو قادرالکلامی کی پہچان سمجھتے ہیں۔

مومن کے کلام میں معنی کی اتنی پرتیں اور بھول بھلیاں ہیں کہ ان تک پہنچنے کے لیے تشریح

وتفہیم میں کئی باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ چند باتیں درج ذیل ہیں:

۱۔ عہد مومن کے لسانی مزاج پر عبور

۲۔ فن موسیقی، علم نجوم، علم طب اور علم حساب وغیرہ کی اصطلاحوں سے واقفیت

۳۔ فارسی زبان پر دسترس

۴۔ الفاظ کے نئے معنوں کے لیے نئے سیاقوں کی پہچان

۵۔ اختراع شدہ نئی تراکیب ومرکبات کے مفہوم ومعنی کی شناخت

۶۔ مومن کے مکرِ شاعرانہ کی سمجھ

۷۔ تخلص کے نت نئے استعمال کی جانکاری

۸۔ فارسی کی شعری روایت سے واقفیت

۹۔ اشعار کی صحیح قرأت

۱۰۔ مومن کی ہم عصر شاعری کے عناصر سے واقفیت

امیر خسرو سے لے کر موجودہ دور کی اردو شاعری کے اسالیب بیان کو ہم بارہ حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں جو اس طرح ہیں: ریختہ گوئی (نمائندہ شاعر امیر خسرو)، دکنی گوئی (نمائندہ شاعر قلی قطب شاہ)، ایہام گوئی (نمائندہ شاعر قایم وآبرو)، عوام پسند گوئی (نمائندہ شاعر نظیر اکبرآبادی)، سہل پسند گوئی (نمائندہ شاعر میر تقی میر)، پرتکلف گوئی (نمائندہ شاعر شیخ ناسخ)، ریختی گوئی (نمائندہ شاعر رنگین)، دقت پسند گوئی (نمائندہ شاعر غالب)، طنز ومزاح گوئی (نمائندہ شاعر اکبرالٰہ آبادی)، محاورہ گوئی (نمائندہ شاعر داغ دہلوی)، علامت گوئی (نمائندہ شاعر میراجی) اور جدید معیار گوئی (نمائندہ شاعر فیض احمد فیض)۔ ان اسالیب میں دقت پسند گوئی میں ہم غالب کے علاوہ مومن اور اقبال کو بھی شامل کر سکتے ہیں جن کے یہاں دقت پسند عناصر کی وجہ ان کی خواص پسند شاعری ہے۔ مزید برآں عربی وفارسی زبانوں سے اردو میں غیر مروجہ الفاظ مستعار لینے کے عمل میں ایک وجہ ہے جو ان کے کلام کو دقت پسند بناتا ہے۔ ان شعرا نے اپنے خیال کو بیان کرنے

کے لیے نئے مرکبات واصطلاحات بھی وضع کی ہیں، کیونکہ اردو زبان ان کے اشعار وارضیات کو پیش کرنے کی متحمل نہیں تھی۔ ان حضرات نے اپنی حسیتوں کو بیان کرنے کے لیے مروجہ الفاظ کو نئے سیاقوں میں بھی ڈھالا ہے۔ جہاں تک مومن کے اسلوب کا تعلق ہے، اس کی سات بنیادی خصوصیات ہیں۔

۱۔ عربی وفارسی الفاظ کو بے دریغ استعمال کرنا

۲۔ فن موسیقی، علم طب، علم نجوم اور علم حساب کی اصطلاحوں کو استعمال کرنا

۳۔ نئی تراکیب ومرکبات وضع کرنا

۴۔ ہم صوت الفاظ کو نئے سیاقوں میں لاکر انھیں نت نئے معنی دینا

۵۔ معاملات عشق میں بہانے تلاش کر کے اپنا مطلب نکالنے کے لیے ایسے الفاظ کا انتخاب کرنا جن کے بظاہر معنی کچھ ہوں اور مراد کچھ اور لیے جائیں، جسے ضیا بدایونی نے اپنی کتاب میں 'مکر شاعرانہ' کہا ہے۔

۶۔ کلیدی الفاظ میں مومن عشق، محبت، آئینہ، آتش، پردہ، صحرا، شب، اور سراپے میں بالخصوص آنکھ، ہونٹ اور زلف بنیادی ہیں، جن کے Collocates سے مومن کا کلام بھرا پڑا ہے۔

۷۔ تخلص مومن کا برجستہ استعمال۔

مومن کے اسلوب میں دقت پسندی کے علاوہ سہل پسندی بھی ہے۔ یہ دونوں Currents مومن کے کلام میں آگے پیچھے چلتے ہیں لیکن اول الذکر غالب ہے۔ غالب اور اقبال کے یہاں بھی یہی صورت حال ہے۔ مومن کے کلام سے چند مثالیں دیکھیے ۔

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

مجھ کو تیرے عتاب نے مارا یا میرے اضطراب نے مارا

کیوں سنے عرضِ مضطر اے مومن صنم آخر خدا نہیں ہوتا

کیا کروں اللہ سب ہے بے اثر ولولہ کیا، نالہ کیا، فریاد کیا

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو　　وہی یعنی وعدہ نباہ کا تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

مومن کے اسلوب کی اس خصوصیت کے ساتھ ان کے کلام میں ایسے اشعار بھی مل جائیں گے جو ان کے ہی لفظ کو الگ الگ سیاقوں میں لا کر ان سے مختلف معنی مراد لیے گئے ہیں۔ جیسے ۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو
بندے کو بھی سلام ہے ایسے سلام کو

ہے یہ بندہ ہی بے وفا صاحب
غیر اور تم بھلے، بھلا صاحب

مومن کو اردو کی عشقیہ شاعری کا امام کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری میں معاملاتِ عشق اور رودادِ عشق کا بیان ہے جسے انھوں نے اپنی بھرپور فنکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ نبھایا ہے۔ ان کا عشق مزاجی ہے جس کے تین محور ہیں: معشوق، عاشق، رقیب اور بس۔ ان کی طبیعت بھی عاشقانہ تھی اس لیے انھوں نے اس میدان میں خوب گل کھلائے ہیں۔ مومن کے عشق میں عریانی کے بجائے شائستگی ہے جس کی وجہ خاندان کی مذہبی روایت ہے۔ وہ خود بھی تقویٰ کے قائل تھے۔ ایک جگہ یہاں تک کہہ دیا ۔

تا سحر شام عبادت تری شب بیداری　　شارح "آیت الکرسی بس حی القیوم

مومن کا محبوب صنف نازک ہے جس میں اردو غزل کے محبوب کی تمام صفات موجود ہیں، یعنی خود بین و خود آرائی، ظلم و ستم ڈھانا، بے وفائی اور وعدہ شکنی وغیرہ لیکن مومن ہمیشہ سر تسلیم خم نہیں کرتے۔ ان کی انانیت بھی کبھی کبھی آڑے آجاتی ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

معشوق سے بھی ہم نے نبھائی برابری　　واں لطف کم ہوا تو یاں پیار کم ہوا

مومن اپنے محبوب کے سراپے کی تعریف میں چہرے سے نیچے نہیں اترتے، البتہ کبھی کبھی خرام

کی تعریف کر لیتے ہیں۔ آنکھوں، ابروؤں، زلفوں اور ہونٹوں کی تعریف میں انھوں نے بے شمار شعر کہے ہیں۔ وہ محبوب سے وصل کی بڑی خواہش رکھتے ہیں جو کبھی نصیب بھی ہو جاتا ہے۔ محبوب کی آنکھ کے بوسے کے وقت پاکیزگی اظہار دیکھیے ۔

بوسہ صنم کی آنکھ کا لیتے ہی جان دی مومن کو یاد کیا حجر اسود آگیا

لیکن کچھ اس طرح کے شوخی بھرے شعر بھی کہہ جاتے ہیں ۔

دست جنوں نے میرا گریباں سمجھ لیا الجھا ہے اس شوخ کے بند قبا کے ساتھ

مومن دوسرے شاعروں کی طرح اپنے معاملات میں عموماً شیخ، ناصح اور واعظ کو بیچ میں نہیں لاتے اور نہ ہی شراب و میخانہ کا زیادہ ذکر کرتے ہیں۔ گل و بلبل و چمن جیسی علامتوں سے بھی ان کے یہاں گریز ملتا ہے۔ جو اردو شاعری میں عام ہیں۔

جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ مومن نے غزلوں کے مقطعوں میں اپنے تخلص کا بھرپور فائدہ اٹھایا ہے اور معنی و مطالب میں زبردست تنوع پیدا کیا ہے، اس سلسلہ میں ذیل میں چند اشعار ملاحظہ کیجیے۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومن آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

دشمن مومن سے رہے بت سدا مجھ سے میرے نام نے یہ کیا کیا

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں ہے حرام، آگ کا عذاب ہمیں

اس نام کے صدقے جس کی بدولت مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

پیہم سجود پائے صنم پر دم وداع مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

مومن کو اپنی عالمانہ اور فنکارانہ صلاحیتوں پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ مختلف علوم، بالخصوص فن موسیقی، علم نجوم، علم طب، علم حساب اور وقت شناسی پر دسترس رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اور اردو زبانوں پر بھی عبور تھا۔ اردو کے علاوہ فارسی میں بھی انھوں نے اپنا دیوان چھوڑا ہے۔ انھوں نے شاعری میں جو راہ نکالی وہ ذوق، غالب اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ جیسے ہم عصروں سے مختلف تھی۔ عشقیہ شاعری میں ان کا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ غالب جیسا بڑا شاعر بھی اس میدان میں کچھ بڑا نہ کہہ سکا۔ بقول

محمد حسین آزاد غالب تو مومن کے اس شعر پر اپنا پورا دیوان تک قربان کرنے کو تیار تھے۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کی بے پناہ صلاحیتوں نے دوسرے بڑے شاعروں کی طرح انھیں بھی خود تعلی کے شعر کہنے پر مجبور کیا۔ ذیل میں چند مثالیں دیکھیے۔

گو ہم صفحہ ہستی پہ تھے ایک حرفِ غلط لیکن اٹھے بھی تو اک نقش بٹھا کے اُٹھے

میرے سینے کے صفحہ میں ہے رقم علمِ دانا دالانِ یونانی

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر مومن نے اس زمین کو مسجد بنادیا

مومن نے میر، ذوق اور غالب وغیرہ دہلی کے دوسرے شاعروں کی طرح اپنے وطن عزیز دہلی کی تعریف میں بھی شعر کہے ہیں۔ دہلی کو جنت پر ترجیح دیتے ہوئے ایک شعر میں کہتے ہیں۔

ہو صورت خاک، دل لگنے کی جنت میں بھلا مومن میری نظروں میں شاہجہان آباد کا نقشہ

مومن کی شاعری کا ایک بنیادی وصف مکرِ شاعرانہ ہے۔ یہ اصطلاح ضیا بدایونی نے مومن کے ایسے اشعار کے لیے وضع کی ہے جن میں وہ مختلف بہانوں سے اپنا مطلب نکالنا چاہتے ہیں، یعنی بظاہر کہتے کچھ ہیں اور مراد کچھ اور ہوتی ہے۔ چند مثالیں دیکھیے۔

سرمگیں آنکھ سے تم نامہ لگاتے کیوں ہو خاک میں نام کو دشمن کے ملاتے کیوں ہو

منظور ہو تو وصل سے بہتر ستم نہیں اتنا رہا ہوں دور کہ ہجراں کا غم نہیں

یہ جامہ پارہ پارہ تڑپنے سے ہوگیا صبح شبِ فراق ہے تو بدگماں نہ ہو

مومن نے اپنے کلام میں عربی و فارسی الفاظ، مرکبات اور تراکیب کا بے دریغ استعمال کیا ہے، جو ان کے اسلوب کو وقت پسند بناتی ہیں۔ سبک رفتن، سخت کوش، سخن گستر، شوق شکوہ اثر، تشنہ کامی، نظر بند وغیرہ جیسی ترکیبیں ہیں، جو ان کے اشعار میں بھری پڑی ہیں۔ اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے غیر مروجہ استعمال کی چند مثالیں دیکھیے۔''

ہر حرکت محرکِ شوق و منتج ہوس قل قل شیشہ، قاہ قاہ مطرب طرفہ زیوری

نہ پوچھ گرمیِ شوقِ ثنا کی آتش افروزی بنا جاتا ہے دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا

رقص و سرور سے تری انجمن نشاطِ گرم شعلہ دود و عارض روشن، زلف عنبری

وہاں کی لاکھوں خلش واں کی ہزاروں فکریں اک جہاں اس پہ یہ ہنگامۂ آلام و غموم

مومن کو نئی تراکیب وضع کرنے کا بھی شوق تھا جو شاید عرفی اور بیدل کا اثر ہے۔ چند مثالیں دیکھیے: آہوئے نیم خواب، بے پردہ خرامی، آشوب گاہ، شوقِ شکوہ اثر (یعنی وہ شوق جس کا اثر شکوہ جیسا ہے)، کافر استخواں پرست (یعنی وہ حاسد جو کلام کی بلاغت سے بے بہرہ ہے) وغیرہ۔

مومن کی شاعری کے کلیدی الفاظ میں سب سے اہم آنکھ ہے، جس کی رعایت سے تشکیل پانے والے الفاظ ان کے اشعار میں بے شمار ہیں۔ چیزوں کو دیکھ کر انھیں محسوس کرنے کے عمل کا اظہار مومن کے کلام کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ مومن کی غزلوں میں کوئی غزل ایسی نہیں ہے جس کے دو ایک شعروں میں آنکھ کی رعایت سے مضمون نہ باندھا گیا ہو۔ کہیں کہیں ایسے الفاظ کو ردیف اور قافیوں میں لاکر نت نئے معنوں میں بھی ڈھال دیتے ہیں۔ چند مثالیں دیکھیے۔

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

مجھ کو کیا کام کہ آئینہ کی حیرت دیکھوں
دیکھ تو آئینہ اور میں تری صورت دیکھوں

جادو کو کیا نرگسِ جادو نے نظر بند

یہ تشنہ کا ہی نگہ کرم دیکھنا
شکوہ کیا بیداد گری کا کیجیے اس سے، دیکھو تو
دیکھے ہے ظالم خنجر، جب ہم زخم جگر دکھلاتے ہیں
دیکھ گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے
اشک غماز میں کیا، آنکھوں میں گھر کرتا ہے
آئے غزالی چشم سدا میرے دام میں
صیاد ہی رہا، میں گرفتار کم ہوا
جو نقاب الٹی، میری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا، عالم اس پردہ نشیں کا دیکھ کر
دشمن جاں عاشقاں دیدار
گر نگاہ تیغ ہے مژہَ خنجر
پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں
مجلس میں نامہ دیکھ سکوں یار کی طرف
دیکھے ہے تجھ کو دیکھ کر اغیار کی طرف

مومن کے کلام کے دوسرے کلیدی الفاظ میں زلف، مومن، آئینہ، آتش، پردہ، شب، صحرا، عشق ومحبت اور لب خصوصاً قابل ذکر ہیں۔

مومن کا اسلوب دقت پسند ضرور ہے لیکن اس طرح انھوں نے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کو ایک دوسرے کے زیادہ قریب لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں ایسے فصیح اشعار بھی مل جاتے ہیں جو عام قاری کے لیے صحرا میں نخلستانوں کا کام کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں مضمون آفرینی، معاملہ بندی، نازک خیالی، اور فکر انگیزی کے علاوہ روانی، سادگی اور شوخی بھی ہے۔ انھوں

نے تصورات کو تحریروں میں ڈھالا ہے۔ وہ بلیغ اشاروں سے شاعری کو معتبر بنانے کا فن جانتے ہیں۔ وہ عشقیہ شاعری کے اسلوب کے مزاج شناس ہیں اور اس تعلق سے اپنے ہم عصروں میں سب سے بلند مقام رکھتے ہیں۔ مومن سے زندگی نے بے وفائی کی اور کم عمری میں ان کا انتقال ہوگیا، ورنہ عالمی شاعری کے افق پر انگریزی کے رومانی شاعر شیلی (ان کا انتقال بھی کم عمری میں ہو گیا تھا) کے بغل میں ایک زیادہ روشن، درخشاں، ستارہ چمک رہا ہوتا۔ مومن کے چند زبان زد اشعار ملاحظہ فرمایئے جوان کی شاعری کی ایک حد تک نمائندگی بھی کرتے ہیں۔

یہ عذر امتحانِ جذبۂ دل کیا نکل آیا
میں الزام ان کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

کیا گل کھلے گا دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

تو کہاں جائے گی کچھ اپنا ٹھکانا کرلے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

الجھا ہے پاؤں یار کا زلفِ دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آگیا

چاک پردہ سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک ہم ہی کیا، سبھی چاک گریباں ہوں گے

اس کے اٹھتے ہی ہم جہاں سے اٹھے
کیا قیامت ہے دل کا آجانا

میرے تغیرِ رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ لگ جائے

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا

تابِ نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
ان کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے

✿✿✿

ڈاکٹر خالد علوی

سردار جعفری کی غالب شناسی

سردار جعفری کو اکثر نقدان فن نے کلاسیکی مزاج کا شاعر قرار دیا ہے۔ کچھ دانشوران نے انھیں اقبال، جوش اور اکبر کے سلسلے کا شاعر ٹھہرایا ہے۔ سردار جعفری کے مطابق ترقی پسند ادیبوں کا ایک فرض یہ بھی ہے کہ کلاسیکی روایات اور ماضی کے حسن کو عام کرنے کی کوشش کریں۔ میر، غالب، ٹیگور، اقبال اور پریم چند کو اب تک اوپری اور درمیانی طبقوں نے پڑھا ہے۔ جب ہمارا ادب عام ہو جائے گا اور ہر انسان اساتذہ کے شاہکاروں سے لطف اندوز ہو سکے تب میرؔ اور غالبؔ کو صحیح معنوں میں عظمت نصیب ہوگی (ترقی پسند ادب، ص 72) جس کے عزائم میں غالبؔ اور میرؔ کو عوام تک پہنچانا شامل ہو۔ اور جس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو جہاں کلمہ اور تکبیر کے بعد پہلی آواز انیس کی آئی ہو۔ جو شخص پانچ چھ سال سے میز پر بیٹھ کر سلام اور مرثیے پڑھنے لگا ہو اور پندرہ سولہ سال کی عمر میں مرثیے کہنے لگا ہو اور مرثیے بھی ایسے:

آتا ہے کون شمعِ امامت لیے ہوئے　　اپنے جلو میں فوج صداقت لیے ہوئے

ان مرثیوں میں ایک ایسا شعر بھی شامل تھا:

کروٹ بدل رہی تھی زمیں درد و کرب سے　　ہلتا ہے دشت گھوڑے کی ٹاپوں کی ضرب سے

تو اس شخص کا اردو کی کلاسیکی روایات سے شغف نہ ہونا تعجب ہے۔ میر اور غالب میں اس کی دلچسپی ایک قدرتی امر کہی جائے گی۔ میر اور غالب کے دام سے نکلنا ناممکن ہی سمجھا جائے گا۔ سردار جعفری کی غالب سے دلچسپی اس تجسس کے باعث بھی تھی کہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی کسی شاعر کا کلام لوگوں میں ذوق کی تسکین کا باعث کیوں کر بنتا ہے۔

سردار جعفری نے نہ صرف ہندی اور اردو زبانوں میں دیوانِ غالب ترتیب دیا بلکہ اس کے دیباچے کو 'پیغمبرانِ سخن' میں دوسری بار میر اور کبیر کے دیباچوں کے ساتھ شائع کیا۔ لیکن سردار کی غالب شناسی کی ابتدا اس سے بہت پہلے ہو چکی تھی اس سلسلے میں مجھے جو پہلا مضمون دستیاب ہوا ہے۔ وہ 'سویرا' میں 1947 میں شائع ہوا تھا۔ جس کا عنوان ہے 'غالب: عبوری دور کا شاعر'۔

'غالب: عبوری دور کا شاعر' میں سردار جعفری نے غالب کو ایک ایسا عبوری دور کا شاعر قرار دیا ہے جو دو زمانوں، دو تہذیبوں کے درمیان کھڑا ہے۔ اس کی پشت ماضی کی طرف ہے اور رخ مستقبل کی طرف۔ اس کے ہم عصر پرانے وقتوں کے لوگ ہیں وہ اسے بخوبی نہیں سمجھ سکے لیکن بعد کی نسلوں نے اسے بخوبی سمجھا۔ غالب کے زمانے میں پرانے جاگیرداری دور کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ جس کی آخری جھلک مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر تھا اور مشینی دور کا آفتاب نکلنے والا تھا۔

سردار جعفری کا خیال ہے کہ غالب ان تبدیل ہوتے حالات کے تمام پہلوؤں کو نہ دیکھ سکا نہ اس کا اظہار کر سکا۔ لیکن وہ دونوں حقیقتوں کی باہمی کشمکش کو وجدانی طور سے محسوس کرتا ہے۔ شعوری طور پر سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس لیے وہ زیادہ وضاحت کے ساتھ تشریح نہیں کر سکتا، سیاسی اور معاشی اصطلاحات استعمال نہیں کر سکتا لیکن اس وجدانی فہم کا اظہار ضرور کرتا ہے۔

یہ مضمون 1947 کا ہے جب ترقی پسند تحریک اپنے شباب پر تھی اور سردار جعفری کا جوش بھی اپنے شباب پر تھا۔ وہ سماجی زیر و بم کے پسِ پشت مادی اور اقتصادی عوامل کی تلاش پر زہر کھائے بیٹھا تھا۔ ان دنوں انقلاب اور بغاوت مذہب کی طرح ترقی پسندوں کو عزیز تھیں اس لیے وہ غالب کو بھی ان لفظوں میں باغی شاعر قرار دیتے ہیں:

"غالب اگر ہمارے عہد میں ہوتا تو ہمارے دور کا سب سے بڑا باغی شاعر ہوتا۔"

غالب کو سب سے بڑا شاعر ہوتے ہوئے بھی بادشاہ کی تعریف ان الفاظ میں کرنی پڑی:

تیرا اندازِ سخن شانہ زلفِ الہام ‏ ‏ ‏ تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

ترا اجلال ترحم مرے جینے کی نوید ‏ ‏ ‏ ترا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

یہاں سردار جعفری وضاحت کرتے ہیں کہ شاعر کو یہ مدح سرائی کیوں کرنی پڑتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ طبقہ واری سماج کے ہر دور میں آرٹ اور ادب پر غلامی کی منحوس پرچھائیں پڑتی رہی ہے۔ صرف کمیونسٹ سماج میں آرٹ اور ادب کو آزادی نصیب ہوگی۔

مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کے قصیدے پڑھ کر غالب سے نفرت نہیں ہوتی بلکہ رونا آتا ہے۔ اور اس نظام زندگی سے ہماری نفرت بڑھ جاتی ہے جس نے زندگی کی بہترین قدروں کو غلام بنا رکھا ہے۔ غالب کے حوالے سے کمیونزم کی تبلیغ کی یہ پہلی کوشش نظر آتی ہے۔ مکمل مضمون میں غالب کے بعض اشعار کو سامنے رکھ کر تشریح کی گئی ہے اور باغیانہ معنی پر زور دیا گیا ہے۔ اگر چہ یہ مضمون سردار جعفری کے ابتدائی مضامین میں ہے لیکن اس مضمون میں بھی انھوں نے غالب کی بعض غیر معمولی خصوصیات تلاش کر ہی لیں۔ مثلاً غالب کے شعر:

عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے

معشوق کی بے وفائی پر طنز بتایا ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ اردو شاعری میں اس شعر کی کوئی مثال نہیں ہے۔

غالب بھی اردو شاعری کی اس روایت کا پاسدار ہے جس میں ہر شاعر نے جھوٹے وعدوں کا رونا رویا ہے لیکن وہ وعدہ فردا پر یقین نہیں کرتا بلکہ شکایت کرنے کی بجائے زیر لب مسکراتا ہے۔

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

غالب کا ساقی کے ساتھ بھی یہی رویہ ہے:

مے پرستاں خم مے منہ سے لگائے ہی بنے ایک دن گر نہ ہوا بزم میں ساقی نہ سہی

غالب اور میر کے دو اشعار کے ذریعے سردار جعفری دونوں شعرا کا فرق بھی واضح کرتے ہیں:

ہم فقیروں سے کج ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا میرؔ

میر کے اس شعر میں افتادگی ہے، مرضی ہے عاجزی ہے۔ اس کے برعکس غالب کے شعر میں سرکشی ہے:

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

سردار جعفری نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ شکوہ وعظمت غالب کے کلام کی بہت بڑی خصوصیت ہے اور اس خصوصیت میں غالب سے صرف اقبال ٹکر لے سکا ہے لیکن اقبال کا شکوہ اجتماعی ہے اور غالب کا انفرادی۔

سردار جعفری غالب کے بیان کو سیدھا سادہ نہیں کہتے بلکہ غالب کے خیال میں ایک بانکپن اور لفظوں کے استعمال میں ایک انفرادیت ہے جس کی مثال پوری اردو شاعری میں نہیں ملتی۔ وہ سیدھی بات کو بھی لہرا کر اور بل دے کر کہتا ہے:

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدا کی　　وہ اک نگہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے

سیدھی سادی بات ہے لیکن اندازِ بیان کے تیکھے پن نے حسن پیدا کر دیا ہے۔ جعفری کا یہ بھی خیال ہے کہ غالب مصرعے کے اندر لفظوں کو نگینے کی طرح جڑ دیتا ہے اور شیشے کے ٹکڑے میں ہیرے کی آب وتاب پیدا کر دیتا ہے۔ غالب کا یہ اندازِ سخن عشقیہ شاعری میں بھی نمایاں ہے۔ وہ معشوق کو سر پہ بٹھاتا ہے۔ اس کے سامنے خلیل اللہ کی بھی مہمانی نہیں کی جا سکتی۔ معشوق کی بے اعتنائیوں کا ذکر کرتا ہے تو اس طرح کہ گویا وہ شاعر کی اپنی نارسائیاں ہیں۔ غالب کی یہ خصوصیات اسے اردو کے تمام شعرا سے ممتاز کرتی ہیں۔ غالب کی محبت اور نفرت دونوں عام شاعروں کی محبت اور نفرت سے قطعی مختلف ہیں۔

محولہ بالا مضمون سردار جعفری کی ابتدائی تحریروں میں سے ہے۔ جب وہ انسانی مساوات کے خواب دیکھ رہے تھے۔ ان کے مطابق نصف دنیا اشتراکی نظام کے حلقے میں آ چکی تھی باقی دنیا میں اضطراب برپا تھا۔ اس وقت ادب کا ہر مطالعہ ان کو طبقہ واری نظام کی یاد دلاتا تھا۔ لیکن جب پیغمبرانِ سخن شائع ہوئی تو ان کے خیالات میں نمایاں تبدیلی آئی۔ بعض نظریات کا ارتقا ہوا، کچھ جوشیلے جذبات کو ترک کرنے میں ہی عافیت سمجھی گئی۔ سردار جعفری نے پہلی بار غالبؔ کو کبیرؔ کے ہی سلسلے کی کڑی قرار دیا۔ ان کے مطابق غالب کے کلام میں اتنی وسعت ہے کہ وہ آئندہ زمانوں کے ہنگاموں کو بھی سمیٹ سکتا ہے۔ تنقید کی زبان میں اس کو تعمیم، ہمہ گیری اور تہہ داری کہا جا سکتا

ہے۔ غالب کو اپنے عہد پر حاوی ہونے کے ساتھ ساتھ لفظوں کے صوتی آہنگ اور معنوی کیفیات سے بھی پوری واقفیت تھی۔ بادشاہوں سے لے کر مے فروشوں تک، دہلی کے علماوفضلا سے لے کر انگریز حاکموں تک بے شمار لوگ دوستوں میں تھے۔ رقص وسرود، شراب، شاہد بازی جو کسی چیز سے پرہیز نہیں کیا۔

سردار جعفری نے منظم فکر اور پیام کی جستجو کو کار دار ٹھہراتے ہوئے بھی غالب کی شاعری کے فکری عناصر اور فلسفیانہ مزاج کی نشاندہی کی۔ انھوں نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ غالب کے یہاں ترک دنیا، ترکِ لذت اور ترکِ طلب کے مضامین شاذ ونادر ہی ہیں۔ غالب کا ذوق اپنی لذت کوشی اور لذت اندوزی میں حدود کا قائل ہی نہیں وہ حسن کو اس طرح جذب کر لینا چاہتا ہے کہ نگاہوں کو بھی اپنے اور معشوق کے درمیان حائل سمجھتا ہے:

وا کردیئے ہیں شوق نے بند نقاب حسن غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

سردار جعفری نے 'ترقی پسند ادب' میں تصوف کو قرونِ وسطیٰ کے کسانوں کی بغاوت کہا تھا لیکن 'غالب' تک آتے آتے تصوف کے بارے میں ان کے خیالات میں انقلابی تبدیلی ہوتی ہے۔ ان کے مطابق غالب نے کائنات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہرداریوں سے بچنے کے لیے تصوف سے مدد لی۔ سردار نے غالباً پہلی بار غالب کے حوالے سے وحدت الوجود، حسنِ حقیقت اور ہمہ اوست کے فلسفوں پر روشنی ڈالی ہے۔ غالب کی فارسی تصنیف 'مہر نیم روز' کے اس حوالے سے کہ عالم کا کوئی خارجی وجود نہیں ہے (یعنی خدا کی ذات سے الگ عالم کا تصور محض وہم وخیال ہے) سردار جعفری نے تصوف اور تصوف کے متعلقات پر بڑی دقیق بحث کی ہے۔ لیکن جہاں جہاں ان کی ترقی پسندی بیدار ہوتی ہے وہیں وہ اپنی ڈگر سے ہٹ کر پرانی راہ پر چل نکلتے ہیں۔ غالب کے شعر:

لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ بادبہاری کا

کے ذریعے وہ غالب کو ہیگل کے فلسفے کے قریب دیکھتے ہیں۔ یہاں ان کو ہیگل کا فلسفہ جدلیت نظر آتا ہے۔ 'پیغمبرانِ سخن' میں غالب کے باب میں سردار جعفری نے عموماً وسیع القلبی اور کشادہ دلی کا ثبوت دیا ہے لیکن جہاں ان کی ترقی پسندی بیدار ہوتی ہے وہاں ان کے بیانات بہت سے

سوالات پیدا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق عمر خیام کی طرح یہ خیال غالب کے یہاں بھی ملتا ہے کہ خاک میں ملنے والی صورتیں لالہ وگل بن کر پھر نمودار ہو جاتی ہیں ممکن ہے یہ محض شاعرانہ خیال ہو۔ کبھی کبھی یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ خیام اور غالب کے ذہن میں تبدیل ہوتے ہوئے مادے کا تصور بھی رہا ہو جو ایک قالب سے دوسرے قالب میں ڈھلتا رہتا ہے۔ مجھ جیسا قاری بڑی حیرت انگیز مسرت سے گزرتا ہے جب جعفری یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ وحدت الوجود کے ڈانڈے ویدانت سے ملتے ہیں اور کہیں نوفلاطونیت سے۔ اس فلسفے میں ذات مطلق، نفیِ ذات اور ترک دنیا کے باوجود ایرانی، تاتاری سے لذت طلبی کا پہلو بھی پیدا ہو گیا ہے۔ یہ آدمی کی ہمت اور ظرف پر منحصر ہے کہ اس منزل میں پہنچ کر کبیر کی طرح ترک دنیا کر دے یا حافظ اور غالب کی طرح رنگ ونور اور صورت و آہنگ سے بھرے ہوئے کھلونے کو اٹھا لے۔ سردار جعفری کے مطابق غالب نے اس عقیدے (تصوف) سے ایک بڑا رجائی نقطۂ نگاہ اختیار کیا ہے جو اس کی شاعری میں خون بہار کی طرح دوڑ رہا ہے۔ رنج وغم تجدید طرب کی بنیادیں ہیں اس لیے ان سے گریز کرنا موت اور کھیلنا زندگی ہے۔ خود موت زندگی کا لطف بڑھا دیتی ہے اور نشاط کار کو وسیلہ بخشتی ہے:

ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا　　نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

دہر کی سختیاں اس لیے ہیں کہ انسانیت کی تلوار سان پر چڑھ جائے:

سختی دہر بود تیغ مرا سنگ فسان

یہی وجہ ہے کہ غالب کے غم اتنے دلآویز ہیں اور ان میں جو نشاط کی کیفیت ہے وہ اردو کے کسی شاعر کے یہاں نہیں ہے۔ غالب کی شاعری میں نشاط وغم کو الگ الگ کرنا ناممکن ہے۔ اسی لیے اس کو صرف نشاط یا صرف غم کا شاعر سمجھنا بھی نادانی ہے۔ وہ دراصل نشاط غم کا شاعر ہے۔

سردار جعفری نے پہلی بار غالب کے تصور عشق کی ایک خوبی کی نشاندہی کی جس خوبی سے اردو شاعری اب تک نا آشنا تھی۔ غالب کے تصور عشق میں جسمانیت زیادہ ہے اور افلاطونیت کم۔ انتہائی خود سپردگی اور نیازمندی کے باوجود غالب کا عشق سربلند اور خوددار ہے:

!

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر دامن کو اس کے آج حریفانہ کھینچئے

سردار جعفری نے غالب کی شاعری کو حرکت سے سرشار قرار دیا ہے۔ جس کا اظہار موج، تلاطم، طوفان، شعلہ، سیماب، برق اور پروانہ جیسے الفاظ کی بہتات سے ہوتا ہے۔ یہ تصور رچ بس کر غالب کے جمالیاتی ذوق کا اہم جزو بن گیا ہے۔ چنانچہ غالب کا معشوق بھی برق و شرر ہے اور غالب اس کی رفتار کا پرستار:

دیکھو تو دلفریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کتر گئی

اسی کے ساتھ غالب کی متحرک اور رقصاں امیجری ہے جو تصویر گری کی معراج ہے۔ جب وہ اپنی اچھوتی تشبیہوں اور نادر استعاروں کا جادو جگاتا ہے تو ایک ایک حرف لذت کرنے لگتا ہے۔ ٹھہرے ہوئے نقوش سیال ہوجاتے ہیں۔ مجرد خیال ایک پیکر رنگ و بو بن کر سامنے آتے ہیں۔ دشت گرمی رفتار سے جلنے لگتے ہیں۔ بیاباں رہرو کے قدموں کے آگے آگے بھاگتے ہیں۔ صحرا کے جسم میں راستے نبضوں کی طرح دھڑکنے لگتے ہیں۔ بے جان پتھروں کے سینے میں ناتراشیدہ بت ناچتے ہیں۔ آئینوں کے جوہروں میں پلکیں لرزنے لگتی ہیں۔ شراب کے پیالے اٹھاتے ہوئے ہاتھوں کی لکیروں میں خون دوڑنے لگتا ہے۔ معشوق کی گفتار سے دیواروں میں جان پڑ جاتی ہے....اور قد کی دلکشی دیکھ کر سرو صنوبر ساتھ ساتھ گھومنے لگتے ہیں۔ پھولوں کی ڈالیاں انگڑائیاں لے کر بلند ہونے لگتی ہیں اور پھول خود بخود گوشۂ دستار کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔

سردار جعفری جو ترقی پسندی کے عروج کے دور میں استعاروں کے مخالف تھے۔ فیض اور جذبی کی نظموں کو محض استعاروں کے پردوں میں مخفی ہونے کی وجہ سے رد کردیا گیا تھا۔ وہی سردار جعفری غالبؔ کی شاعری میں استعاروں کے جادو جگانے کی بات کررہے ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے ترقی پسند ادب میں دعویٰ کیا تھا کہ وہ سادہ اور سلیس زبان میں کتاب لکھ رہے ہیں۔ یہاں غالب کے اشعار سے مستعار زبان میں تقریباً استعاراتی انداز میں عرض مطلب کررہے ہیں۔

سردار جعفری نے غالب کو بحیثیت شاعر ہی نہیں قدر و قیمت کا تعین کیا۔ بلکہ غالب کی فارسی

نثر، خطوط، فارسی شاعری اوراردوشاعری کے حوالے سے غالب کے : ن اور تصورات کا بھی خاکہ کھینچنے کی کوشش کی۔ان کا یقین ہے کہ غالب کے پاس سماجی ارتقا کا ایک باقاعدہ اور معقول تصور بھی موجود تھا۔ اور حسرتِ تعمیر اس کے سینے کا سب سے بڑا درد۔ جب وہ یہ کہتے ہیں کہ نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ تو یہ چند سکّوں، چند پیالوں یا چند بوسوں کی آرزو نہیں بلکہ ایک ناآفریدہ گلشن کی تمنا ہے جس کے نشاط تصو نے نغمہ سنجی پر مجبور کردیا ہے اور اس کے ناآفریدہ گلشن کو صرف ذاتی خواہشات کا گلشن سمجھ لینا غالب کی توہین ہے۔اس میں سماجی امکانات کا تصور بھی شامل ہے۔

سماجی ارتقا ہی نہیں بلکہ غالب کی کائنات میں انسان کو کتنی بلندی حاصل ہے۔ سردار جعفری نے اس کی نشاندہی بھی بڑے سلیقے اور ناقابل تردید طریقے سے کی ہے:

''اس کے بعد یہ سمجھنے میں دشواری باقی نہیں رہتی کہ غالب کی کائنات میں انسان کی کیا جگہ ہے۔یوں تو وہ بھی اور مخلوقات کی طرح پرت :ات ہے لیکن انسان اور کائنات کی باقی چیزوں میں فرق ہے۔اور یہ بہت بڑا فرق ہے۔ انسان کے پاس آرزو ہے، جذبہ ہے، شوق ہے تڑپ ہے اس کے ضمیر میں ایک ہنگامہ ہے جو بحر وجود میں پانی کے غم کی طرح ہے اور ریشم کے لچھے میں تار کی طرح۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کے پاس عقل ہے وہ اپنے ہاتھوں اور دل کے تعاون سے اپنا کردار حاصل کرتا ہے۔''

دل و دوست باہم دگر دوختہ
در ایں کیسہ کردار اندوختہ

(ص176)

غالب اپنے بعض خطوط میں یہ خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں اس شہر میں بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ سردار جعفری اسے غالب کے تصور انسان کا ثمرہ بتاتے ہیں۔ انسانوں کی دربدری اس کی عظمت کے منافی ہے۔ وہ جب خدا سے یہ کہتا ہے کہ تو نے

صرف ایمان کا شعلہ روشن کیا ہے۔ تمدن اور شہروں کی نمائش تو انسانی زناً ہے تو یہ بھی غالب کے اعلیٰ اور ارفع تصورِ انسان کا نتیجہ ہے۔ وہ انسان کی رسوائی پر خدا سے بھی سوال کرتا ہے:

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند گستاخیِ فرشتہ ہماری جناب میں

غالب کی شاعری میں طنز و ظرافت کے لاتعداد اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ ان اشعار کو عموماً غالب کی ظرافت کا اظہار سمجھا جاتا ہے۔ سردار جعفری نے طنز و ظرافت کو غالب کی سپر اور ڈھال قرار دیا ہے۔ جن کے بوتے پر غالب نے بھوک، تذلیل اور آشوب دہر کا مقابلہ خود اعتمادی اور مردانہ زہر خند کے ساتھ کیا ہے۔ یہ طنز کے تیر ناداری اور بیزاری کے زہر میں بجھائے جاتے ہیں اور خود اعتمادی اور انانیت کی کمان سے پھینکے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ خوش دلی کا معمولی سا عمل ہے لیکن دراصل یہ سپر ہے۔ جسے غالب نے زمانے کے واروں سے بچنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ وہ طنز اور ظرافت کی چھلنی میں آنسوؤں کو چھان دیتا ہے اور چھلنی کے بھیگے ہوئے چھیدوں پر بے شمار مسکراتے ہوئے ہونٹوں کا گمان ہوتا ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ہائے اس زودِ پشیماں کا پشیماں ہونا

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

سردار جعفری کا خیال ہے کہ ظرافت اور طنز کی اس سپر کے بغیر آشوب دہر کا مقابلہ ممکن نہیں تھا۔ اس وجہ سے غالب کی انانیت کبھی کسی کو خاطر میں نہیں لائی۔ غم عشق اور غم روزگار بھی اس کا سر نہ جھکا سکے۔ مجنون، فرہاد، خضر، سکندر، زمانہ ہو یا خوبان دل آزار کوئی غالب کی آنکھوں میں نہیں سماتا۔ وہ خدا کی بندگی میں آزاد و خود بیں ہے اور بے وفاؤں کے عشق میں بھی۔ اس کا سب سے خوبصورت اظہار بازیچہ اطفال...والی غزل میں ہے۔

سردار جعفری نے ابتدائی مضمون میں غالب کے قصیدوں کو پڑھ کر رونا آنے کی بات کہی تھی لیکن اب وہ قصیدوں کو محض کمزور پہلو کہہ کر بعض دوسری خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

''یہ شان قصیدوں میں بھی برقرار رہتی ہے۔ حالانکہ یہ غالب کی شاعری کا

کمزور پہلو ہے لیکن اس کا اعتراف نہ کرنا غلط ہوگا کہ حالات زمانہ سے مجبور ہو کر اس نے اپنا ہاتھ پھیلایا ضرور لیکن اس کو ہمیشہ ذلیل پیشہ سمجھتا رہا (غیر کیا خود مجھے نفرت مری اوقات سے ہے) اور پھر کلیات فارسی کے دیباچے میں اس پر افسوس کیا ہے کہ آدھی شاعری نااہلوں کی قصیدہ خوانی میں صرف ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ کا مدحیہ حصہ کمزور ہے اور تشبیب کا حصہ نہایت زوردار اور شاعرانہ، اس کو یہ احساس بڑی شدت سے تھا کہ جس کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں اس سے میرا درجہ بلند ہے۔ اور بعض قصیدوں میں اس کا اظہار کرنے کے لیے غالب نے اپنی برتری کا پہلو نکال لیا ہے۔'' (ص 198)

سردار جعفری نے غالب کے تاریخی شعور کی بھی نشاندہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ غالب کو اندازہ ہوگیا تھا کہ مغل تہذیب اور سماج کا چراغ اب ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ حالانکہ یہ قدیم قدریں غالب کو بہت عزیز تھیں لیکن غالب کو علم تھا کہ یہ جڑیں کھوکھلی ہو چکی ہیں۔ غالب نے نئی دنیا کی جھلک بھی دیکھ لی تھی جو سائنس اور صنعت کی ترقی کے ساتھ آرہی تھی۔ یہاں سردار جعفری یہ نشاندہی کرنے سے نہیں چوکتے کہ غالب انگریزوں کی لائی ہوئی سائنس اور صنعت کا تو اندازہ کرتا ہے لیکن استحصالی قوت کا اندازہ نہ کرسکا۔

تمام ترقی پسند نقادوں نے غالب کی تقریظ آئین اکبری کا نمایاں انداز میں ذکر کیا ہے۔ ان میں محمد علی صدیقی، مجنوں گورکھپوری، احتشام حسین اور ممتاز حسین شامل ہیں۔ سردار جعفری بھی استثنا نہیں ہیں:

''غالب نے غزل کے استعاروں کے سارے محابات چاک کر کے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ آنکھیں کھول کر صاحبان انگلستان کو دیکھو کہ وہ اپنی ہنرمندی میں اگلوں سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ انھوں نے ہوا اور موج کو بے کار کر کے آگ اور دھویں کی طاقت سے اپنی کشتیاں سمندروں میں تیرادی ہیں۔ وہ بغیر مضراب کے نغمے پیدا کر رہے ہیں اور ان کے جادو سے الفاظ چڑیوں کی طرح

اڑ رہے ہیں۔ ہوا میں آگ لگ جاتی ہے اور بغیر چراغ کے شہر روشن ہو جاتے ہیں
۔اس زمین کے آگے سارے آئین فرسودہ ہو چکے ہیں۔ جب موتیوں کا خزانہ
سامنے ہو تو پرانے کھلیانوں سے خوشہ چینی کی کیا ضرورت ہے۔" (ص186)

'مردہ پروردن مبارک کار نیست' کا فلسفہ تمام مارکسی نقادوں کو خوش آتا ہے اس لیے سب نے نہایت تفصیل اور خاصی مبالغہ آمیز حاشیہ آرائی کے ساتھ غالب کے سماجی ارتقا کے تصور سے جوڑا ہے۔ غالب کی دور اندیشی اور آئندہ زمانے کی آہٹوں کا اندازہ کرنے کی قوت کو دیکھتے ہوئے یہ بھی ممکن ہے کہ غالب کو یقین ہو گیا ہو کہ آئندہ زمانہ صاحبان انگلستان کا ہے۔ اس لیے ان کی ایجادات کی تحسین منافع بخش ہوگی۔ ورنہ آئین اکبری نہ اس وقت کارِ رائیگاں تھی نہ آج ہے۔ اس پر مستزاد سرسید کی تدوین، جس کا مقابلہ آج کے ترقی یافتہ اور لامحدود وسائل کے باوجود نہیں کیا جا سکتا۔ مجنوں گورکھپوری نے غالب کی اس رائے کو "آئین اکبری پر غالب کی نیک نیتی کے ساتھ نپی تلی رائے" بتایا ہے (غالب شخص اور شاعر، ص100)۔ دیگر لوگوں کی بھی کم و بیش یہی رائے ہے۔ لیکن سردار جعفری غالب کے 'مردہ پروردن مبارک کار نیست' کی تو تحسین کرتے ہیں لیکن آئین اکبری کی اہمیت سے انکار نہیں کرتے۔

سردار جعفری نے غالب کے کلام کے ان حصوں کو ہی اہمیت نہیں دی جن کی کوئی سیاسی یا سماجی توضیح ممکن تھی بلکہ غالب کی شاعری کو بھی نشان زد کیا ہے۔ جن میں محض محبوب کی کج ادائی نو بہار نور اور محبوب کے جسم کے رنگ و نور کے طوفان کو موضوع بنایا گیا:

"کبھی کبھی یہ گمان گزرتا ہے کہ غالب نے اپنے احساس غم کا حسین و جمیل
پیکر اپنے نو بہار ناز معشوق کے پیکر سے ناپ کر تراشا ہے۔ معشوق کے جسم میں
رنگ و نور کا طوفان ہے اور احساسِ غم میں خون کی موجیں بل کھا رہی ہیں اور
شاعر ان دونوں سے بیک وقت کھیل رہا ہے۔ اور ہنس ہنس کر بادہ عیش و نشاط
طلب کر رہا ہے۔ سر پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں لیکن وہ کسی طرح

آستانِ یار سے اٹھنے کے لیے تیار نہیں ہے۔'' (ص 174)

موجِ خوں سر سے گزر ہی کیوں نہ جائے　آستانِ یار سے اٹھ جائیں کیا

خانہ زادِ زلف میں زنجیر سے بھاگیں گے کیوں　ہیں گرفتارِ وفا زنداں سے گھبرائیں گے کیا

سردار جعفری جن کے تنقیدی نظریات کے مطابق کسی تخلیق کا اصلی حسن موضوع سے ہوتا ہے، اسلوب سے نہیں لیکن غالب کے اسلوب، غالب کی امیجری اور غالب کے محبوب الفاظ کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ ان کے مطابق 'شوق' غالب کا نہایت محبوب لفظ ہے۔اس خاندان کے دوسرے الفاظ تمنا، آرزو اور خواہش ہے اس کی شاعری چھلک رہی ہے۔ جنون جو شوق کی انتہا ہے اس کو ہمیشہ اکسا تا رہتا ہے۔اس کو معلوم ہے کہ شوق انتہائی عاجزی میں بھی انسان کو سربلند کر دیتا ہے اور ذرّے کو صحرا کی وسعت اور قطرے کو دریا کا تلاطم عطا کرنا ہے۔اس لیے شوق اور طلب کی راہ میں وہ ایک لمحے کے لیے بھی آسودہ نہیں ہونا چاہتا۔منزل سے کہیں زیادہ لذت منزل کی جستجو میں ہے کیوں کہ منزل آسودگی ہے اور آسودگی روح و دل کی موت...

یہی نہیں مرزا غلام حسین قدر بلگرامی کے نام اس خط کا حوالہ بھی دیتے ہیں جس میں غالب لغت انگریزی کو شعر میں لانا جائز قرار دیا ہے۔

'تمنا کا دوسرا قدم' (پیغمبرانِ سخن) میں سردار جعفری نے پھر اعادہ کیا ہے کہ غالب کی شاعری دو زبانوں کی ترجمان بن کر ہمارے ہاتھ میں آئی ہے۔اس میں ایک عہد کا خمار اور دوسرے عہد کا نشہ ہے۔ جاتی ہوئی رات کا کرب اور طلوع ہوتی ہوئی سحر کا نشاط حل ہو گیا ہے۔ غالب کی شاعری اپنے عہد کے شکنجوں کو توڑ دیتی ہے اور ماضی اور مستقبل کی وسعتوں میں پھیل جاتی ہے۔اس نے ہر تجربے کو انسانی نفسیات کی آگ میں تپا کر پگھلایا ہے کلیے کی کسوٹی پر کسا ہے۔ پھر شعر کی شکل میں ڈھالا ہے۔تب اس کے یہاں ایک عالمگیر اور آفاقی شاعر کا لہجہ پیدا ہوا ہے۔اور وہ زندگی کے ہر لمحے کا شاعر بن گیا ہے۔اس کی شاعری سے لطف اندوز ہونے کے لیے صرف لفظی معنوں سے

واقف ہونا ہی کافی نہیں ہے۔ شعروں کو بار بار پڑھنا بھی ضروری ہے۔ پھر لفظ حرفوں کے مجموعے کی شکل میں نہیں بلکہ تصویروں کی شکل میں پہچانے جائیں گے۔ آدمیوں کے چہروں کی طرح آہستہ آہستہ مانوس ہوں گے اور اپنی شخصیت ظاہر کریں گے۔ لفظوں کا صوتی لو محسوس ہوگا اور باہمی ٹکراؤ کی جھنکار سے کان آشنا ہوں گے، تب جا کر معنوی ترنم اور داخلی آہنگ کے دروازے کھلیں گے۔

غالبیات کے سلسلے کا سردار جعفری کا آخر مضمون 'غالب کی کہانی سردار جعفری کی زبانی' 'نوائے ادب' بمبئی دسمبر 2000 میں شائع ہوا۔ یہ مضمون غالب کے سلسلے کا ہی نہیں بلکہ سردار جعفری کا بھی آخری مضمون ہے۔ یہ ایک تقریر معلوم ہوتی ہے جسے قلم بند کر کے شائع کر دیا گیا۔

اس مضمون میں بھی سردار جعفری نے غالب کو کئی عہدوں اور زمانوں کا شاعر قرار دیا ہے۔ غالب کے عہد میں جو تہذیب ختم ہو رہی تھی اس کا غالب نے ماتم کیا ہے اور وہ تہذیب جو غالب کے شعور و احساس کا حصہ تھی جس کو غالب چاہتے تھے کہ وہ آئے اور ہندوستان کی برکت کا باعث بنے۔ اس مقام پر غالب نے شاعری کی ہے اور اس میں یہ تینوں عہد غالب کے یہاں ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔

سردار جعفری نے غالب کو زندگی کے ہر لمحے کا شاعر کہا ہے۔ انھوں نے غالب کے بہت سے اشعار کی مثالیں دی ہیں۔ جو زندگی کے بہت سے مراحل پر ہماری دستگیری کرتے ہیں۔ سردار جعفری نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ غالب نے ہی ان کی تربیت کی ہے۔ جب مجنوں گورکھپوری اور دوسرے ترقی پسندوں کے لیے غالب کی خوبی محض جرأت اظہار تھی　چاہے خدا کے سامنے ہو یا معشوق کے سامنے (مجنوں ص 59) سردار نے پہلی بار ترقی پسند تنقید کے زیر سایہ غائب کی شخصیت اور شاعری کے گوشے بے نقاب کیے جن پر اب تک پردے پڑے ہوئے تھے۔ اس طرح انھوں نے اختر حسین رائے پوری جسے ترقی پسندوں کی اس سخت گیری کا عملی جواب بھی فراہم کر دیا جس میں اختر حسین رائے پوری نے کہا تھا کہ غالب کے خطوط پڑھ کر انھیں اپنا سر پیٹنے کا جی چاہتا ہے۔

❋❋❋

ریاض قدوائی

مومن کی غزل کعبۂ معنی

کعبہ معنی بنا مومن کا ہر بیت الغزل --- مومن کی غزل کے بارے میں اپنے زمانہ کے مشہور تذکرہ نگار ناطق لکھنوی نے یہ کہا تھا۔ حکیم مومن خاں مومن بن حکیم غلام علی خاں کی پیدائش 1800ء میں اور وفات 1855ء میں ہوئی ان کے اشعار میں اتنی تاثیر اور گہرائی تھی کہ غالب کو بھی رشک ہوتا تھا جس کا انہوں نے اظہار کیا۔ ان کی کچھ غزلوں کے مفہوم پر یہاں طائرانہ نظر ڈالی گئی ہے۔

ردیف الحاء

گر چندے اور یہ ہی رہی یار کی طرح ہم بھی بنیں گے بو الہوس اغیار کی طرح

اگر چند روز اور دوست یعنی محبوب کا یہی انداز رہا تو غیروں کی طرح ہم بھی بس ہوس کے بندے بن جائیں گے۔

آواز گنبد اس سے شکایت عدو کی تھی ناچار چپ ہیں صورت دیوار کی طرح

محبوب سے غیر کی شکایت کا جواب نہ ملا سوائے اپنی ہی صدائے بازگشت کے۔ مجبوراً ہم چپ ہیں جیسے دیوار بے حس وحرکت ہوتی ہے۔

سونے دیا نہ اس نے شب وصل میں بھی کیا ہم جاگتے ہیں طالع بیدار کی طرح

محبوب کی جدائی میں اور اس کے انتظار میں تو شاعر کی راتیں جاگتے کٹتی ہی تھیں، جب ملنے کی باری آئی تو وہ بھی کیا ستاروں کی طرح اس کی بھی بیداری ہے؟

پھرتا ہے بہر کشتن عشاق کو بہ کو گردش میں ہے وہ چرخ ستمگار کی طرح

معشوق اس طرح اپنے چاہنے والوں کا (نگاہوں سے) گلی گلی قتل کرتا پھرتا ہے جیسے آسمان

کے ستارے اپنی گردش سے ستم ڈھاتے ہیں۔

ہوتے ہیں پائمال گل اے بادِ نوبہار رو　　کس سے اڑائی تو نے ہر فتار کی طرح

محبوب کو نئی آنے والی بہار کہا ہے جس سے اصل پھولوں کو رشک ہوتا ہے جیسے وہ روندے جارہے ہوں۔

چین جبیں بلا و نگاہ غضب ستم　　کرتی ہے قتل اس بت خونخوار کی طرح

جیسے وہ قاتل یعنی محبوب خود جان لے لیتا ہے وہ کام اس کے ماتھے کے بل اور غضبناک (قہر کی) نگاہ کا بھی ہے۔

خورنج رشک غیر کی بھی ہم کو ہوگئی　　اب اور کچھ نکالئے آزار کی طرح

غیر یعنی رقیب کی رقابت کی کوفت کی تو عادت ہوگئی ہے شاعر محبوب سے کہتا ہے کہ اب دکھ پہنچانے کا کوئی اور طریقہ نکالے

ہوتے ہیں قتل غیر ادھر ہے نگاہ لطف　　ارماں مرے نکلتے ہیں تلوار کی طرح

''غیروں پر نگاہ مہربانی کی ہے مگر میرے ارمان تو میرے لئے تلوار بن جائے ہیں۔''

کرتا ہے ابر اپنا لہو پانی ایک کیوں　　کب رو سکے گا دیدۂ خونبار کی طرح

شاعر کہتا ہے کہ جس طرح اس کا خون آنسو بن کر بہہ رہا ہے اس کے آگے بادل کا پانی بہانا بیکار ہے۔خون پسینہ ایک کرنا، دن رات ایک کرنا یہاں قابل غور ہے بادل کا اپنا لہو پانی ایک کرنا۔

بس ناز کی ضعف کہ گلگشت باغ میں　　چبھتے ہیں میرے پاؤں میں گل خار کی طرح

بقول شاعر عاشق اتنا زیادہ کمزور عشق میں ہوگیا ہے کہ باغ میں پھول بھی پیروں کو کاٹتے معلوم ہوتے ہیں۔

دل میں ہوائے بت کدہ ظاہر میں کیا حصول　　رہنا حرم میں مومن مکار کی طرح

مفہوم یہ ہے کہ اپنے آپ کو مکار کہہ کر ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو بت پرستی کی روایات کے اثر میں ہیں پھر رسم ادا کرنے سے کیا حاصل۔مقطع کو چھوڑ کر اس غزل کے زیادہ تر، غالباً تقریباً سبھی

اشعار کے پس منظر میں ان کے زمانے کے ارباب اقتدار کے ظلم وستم ہیں۔
نوٹ: طالب علموں کو اگر علم نہ ہو تو جان لیں مومن نے کئی جگہ لفظ طرح ''مثل'' کے نہیں بلکہ انداز یا طریقہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی مری طرح

معشوق سے کہہ رہے ہیں کہ اگر اس کا دل بھی آئندہ کہیں لگ گیا، تو شاعر کی طرح کئی پہر روتے ہی گزرے گی۔

آتا نہیں ہے وہ تو کسی ڈھب سے داؤ میں ملتی نہیں ہے ملنے کی اس کے کوئی طرح

پھر محبوب کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس پر کوئی طریقہ اثر نہیں کرتا اور ملنے کی کوئی صورت نہیں نکلتی

تشبیہ کس سے دوں کہ طرحدار کی مرے سب سے نرالی وضع ہے سب سے نئی طرح

شاعر کے طرحدار محبوب کے ایسے نرالے انداز و ادائیں ہیں جن کی کسی انسان یا چیز مثال ہی نہیں دی جاسکتی

مر چک کہیں کہ تو غم ہجراں سے چھوٹ جائے کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

مومن کی غزلوں میں عاشق و معشوق کے تمام باہمی انداز و مکالموں کی تصویر کشی ہے۔ عاشق کو کوسا جاتا ہے کہ مر جائے تو اس کا جواب ہے کہ یہ تو میرے لئے اچھا ہے مگر کہنے کا انداز برا ہے۔

نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح

سچے عاشق کا بیان ہے، اس کو کسی طرح چین نہیں ملتا، دور رہنے سے بھی نہیں اور ملنے سے بھی نہیں

لگتی ہیں گالیاں بھی تیرے منہ سے کیا بھلی قربان تیرے پھر مجھے کہہ لے اسی طرح

اس شعر میں ایک پچھلے شعر کی نسبت برعکس بات ہے۔ کوئی جس کو چاہتا ہے اس کی زبان سے گالیاں بھی اچھی معلوم ہوتی ہیں۔ دل چاہتا ہے کہ وہ دہراتا رہے۔

پامال ہم نہ ہوتے فقط جور چرخ سے آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح

اگر صرف آسمان یعنی مقدر ظلم ڈھاتا تو ہم ایسے تباہ نہ ہوئے لیکن ہر طرح سے دوسری مصیبتوں

نے بھی گھیرا

نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے کیا کیجئے ہمیں تو ہے مشکل بھی سبھی طرح

شاعر مخمصے میں ہے، نہ تو محبوب کے گھر جاتے بنتا ہے نہ بغیر جائے چین ہے، ہر طرح مشکل ہے۔

معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہان میں کرتا ہے کون ظلم کسی پر کسی طرح

شاعر کا معشوق ظلم وجور میں عدیم المثال ہے ورنہ اور بھی محبوب ہیں جو اتنی قیامت نہیں ڈھاتے

ہوں جاں بلب بتان ستمگر کے ہاتھ سے کیا سب جہاں میں جیتے ہیں مومن اسی طرح

سوال کرتے ہیں کہ جس طرح ظالم حسینوں کے ہاتھوں ہم قریب المرگ ہیں کیا دوسروں کا بھی یہی حال ہوتا ہے یعنی زندگی اجیرن رہتی ہے؟

ردیف الخاء

عدو نے دیکھے کہاں اشک چشم بریاں سرخ نہ آستیں ہے نہ رومال ہے نہ داماں سرخ

ہماری جلتی ہوئی آنکھوں کے خون کے آنسو جن سے آستین، رومال اور دامن تک رنگا ہے، یہ سب غیر رقیب کیا جانے؟

نمود حسن خط یار سے نہ ہو کیونکر بہار ہے جو تہ سبز ہو نمایاں سرخ

ہلکا ہلکا خط بڑھنے کو سبزہ بھی کہتے ہیں جس کے نیچے جلد کی آب وتاب (بہار) سرخ رنگ کو نمایاں کررہی ہے اس طرح معشوق کے بال حسن کو ابھارتے ہیں

تمہارے دشنہ کا دست جفا نے کام کیا ہے ررد رنگ گلو حلقۂ گریباں سرخ

زبس فگار ہوئے پاؤں خارو خارا سے تمام دشت سے جوں وسعت گلستاں سرخ

جس طرح باغ پھولوں سے سرخ ہوتا ہے ایسے ہی کانٹوں اور پتھروں سے میرے زخمی پاؤں نے ویرانے کو رنگین بنادیا (سنگ خارا)

ملی ہیں غیر نے پائے نگار سے آنکھیں سرشک جوں سے نہیں پنجہ ہائے مژگاں سرخ

یقیناً رقیب نے محبوب کے پیروں پر آنکھیں رگڑی ہیں ورنہ ان میں خون کی سرخی تو آنہیں سکتی کیونکہ وہ خون کے آنسو روتا ہی نہیں سرخی محبوب کے پیروں کی ہے۔

گمان قہر سے اپنا تو رنگ زرد ہے اور سیاہ مستی مے سے ہے چشم جاناں سرخ

ہوا ہوں عشق میں گل پیرہن کے لازم ہے مرا کفن بھی ہو جوں جامۂ شہیداں سرخ

چونکہ مجھے پھولوں کا لباس پہننے والے معشوق سے عشق ہے لہٰذا لازمی ہے کہ مجھے ایسے کفن پہنا یا جائے جو شہیدوں کے لباس کی طرح سرخ ہو۔

سرائتیں ہیں یہ طوفان اشک خونی کی کہ ایک ایک شجر ہے برنگ مرجاں سرخ

میرے خون کے آنسو جو طوفان لائے ہیں اسی کے اثر سے ہر ایک پیڑ پودا مرجان کی طرح لال ہو گیا ہے۔

کرم جو غیر پہ دیکھا لہو اتر آیا نہ پوچھ کیوں تری آنکھیں ہیں بن کے ناداں سرخ

غیر پر عنایت دیکھ کر آنکھوں میں خون اتر آیا حالانکہ آنکھیں بظاہر انجان بن گئیں۔اس لئے یہ سرخ ہو گئیں۔

نوید مرگ انہیں جو ہیں زخمی لب یار کہ رنگ پاں سے ہوئے اور لعل خنداں سرخ

محبوب کے ہنستے ہوئے لال ہونٹوں پر پان کی اضافی لالی چڑھ جاتے دیکھ کر لوگوں پر گویا تلوار چل گئی۔اب تو ان کی موت ہی اس تڑپ کو ختم کر سکتی ہے۔

نظارۂ رخ مردم سے کیوں نہ غم ہو کہ تھا ہمارا رنگ بھی پیش و رود ہجراں سرخ

ہم کو کیوں نہ خوش وخرم لوگوں کو دیکھ کر کوفت ہو کیوں کہ ہجر کے عذاب سے پہلے ہمارا بھی رنگ سرخ تھا۔

ہمارے خون کا دھبہ نہ جائے حشر تلک وہ لاکھ بدلے قبا پر رہے گا داماں سرخ

ظالم کے ظلم کے نشانات مٹ نہیں سکتے چاہے وہ جتنی ترکیبیں کرے۔دامن پر تا قیامت دھبہ

رہے گا۔

غریق گریۂ خونی رہا نہ کر مومن　　　لباس یعنی پہنتے نہیں مسلماں سرخ

خون کے آنسو رونے سے لباس تک سرخ ہو جاتا ہے جب کہ مسلمان سرخ لباس نہیں پہنتا۔ لہٰذا یہ نہیں کرنا چاہئے۔

ردیف الدال

ہم دام محبت سے ادھر چھوٹے ادھر بند　　　پرواز بھی کی آہ تو جوں طائر پر بند

جو عاشق ہیں وہ محبت کے جنجال سے بس دم بھر کو چھوٹتے ہیں اور آزادی بھی ملی تو ایسی کہ جیسے پرندے کے پر باندھ دیۓ گیۓ ہوں

دیکھا نہ کسی کی طرف ایمائے حیاء سے　　　جادو کو کیا نرگس جادو نے نظر بند

مومن کے دور سے ابتک اس شعر کی ستائش میں سب نے الفاظ کے نہ معلوم کتنے دریا بہائے ہوں گے ۔ اگر کسی جادو کے ذریعہ کسی کی آنکھ نرگس کا پھول بن جائے تو ہر نگاہ اس پر پڑے گی۔جس سے لامحالہ شرم آئے گی اس حیاء نے آنکھوں کو تالا لگا دیا۔نظر بندی بھی ایک طرح کا جادو ہے۔لہٰذا ''نظر بند'' ذومعنی ہے۔

یہ مشت پر سوختہ پھوکیں گے قفس کو　　　تو ساتھ کسی کے مجھے صیاد نہ کر بند

قید پرندے کی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ اس کے مٹھی بھر پر حرارت سے جل رہے ہیں اس کو کسی اور کے ساتھ صیاد بند نہ کرے ورنہ پنجرے یا قید خانے میں آگ لگ جائے گی ۔دوسرا بھی جل جائے گا۔

وہ آخر شب آئے ہیں کچھ بات تو کرلوں　　　کر اپنی زباں دم کے دم اے مرغ سحر بند

عاشق کہتا ہے کہ معشوق ایسے وقت آیا جب رات ختم ہونے لگی ۔وہ مرغ سے کہہ رہا ہے کہ اپنی بانگ ذرا دیر ملتوی کر دے تا کہ دو باتیں کرلوں

کیا ٹھہرے دل بوالہوساں میں تری الفت　　　شیشہ میں پری کرتے ہیں ارباب ہنر بند

اہل ہوس تیری الفت کو کیا سمجھیں گے؟ اس دنیا میں تو لامکاں لال پری کو شیشے میں بند کردیا جاتا ہے۔

جاسکتے نہیں جاتے ہیں اس کو میں جو ناصح چھٹ جائیں گے قصہ تو نے اگر بند

شاید کہیں تو نے بھی اسے خواب میں دیکھا آنکھیں تری اے بخت ہیں کیوں آٹھ پہر بند

شاعر اپنے سوئے مقدر یعنی ستارے سے کہہ رہا ہے کہ اس نے بھی میرے طرح خواب میں محبوب کو تو نہیں دیکھ لیا آخر کیوں ہر وقت اس کی آنکھیں بند رہتی ہیں۔

اے سوزش سینہ مجھے وہ سینہ دکھا دے کھولے تری گرمی سے وہ گھبرا کے مگر بند

اس شعر میں لفظ ''مگر'' شاید کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کچھ نہیں کہوں گا۔

کیا حضرت مومن کہیں کعبے کو سدھارے زعفراں ہی کیوں ہو مجھ کو رلاتی ہے بہار

آج مومن کے گھر میں سناٹا ہے اور دروازہ بھی بند ہے، کیا وہ کعبہ کو چلے گئے ''مومن اور کعبہ'' میں لطیف رعایت لفظی ہے۔

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد جیسے قفس میں مرغ چمن کو چمن کی یاد

جس طرح قید میں پرندے کو اپنے باغ کی یاد ستاتی ہے اسی طرح ہم کو وطن سے دور وطن کی یاد پریشان کرتی ہے

گلگوں قبا پہن کے کیا قتل غیر کو کیا آئی اپنے کشتۂ خونی کفن کی یاد

معشوق جس نے سرخ لباس پہن کر غیر کا دل لوٹ لیا یعنی جان لے لی اس سے پوچھ رہے ہیں کہ ایسا کیوں کیا؟ کیا تمہیں اس واقعی جان دینے والے کی یاد آگئی جس کا لباس خون سے رنگین تھا۔

از خویش رفتگی ہے عناں کش زباں زباں دکھلائے گی عدم ہی کہیں اس دہن کی یاد

محبوب کے منہ (دہن) کی یاد اس طرح میرے ساتھ ساتھ پیچھے پڑ گئی ہے کہ موت ہی سے ہم کنار کرے گی۔

تو آب زن نہ ہوئے تو کیا جانے کیا کرے دشمن کے دل سے میرے دم شعلہ زن کی یاد

میری جلتی آہیں دشمن کے دل کو جلائے دے رہی ہیں۔ وہ پانی کا سہارا نہ لے تو کیا کرے؟

اے محتسب تو نہ توڑ یوں شیشہ کو دیکھنا آئی ہے مجھ کو سنگ دل دل شکن کی یاد

نصیحت کرنے اور عمل کا حساب لینے والے سے کہہ رہے ہیں کہ دیکھ شیشہ مے نہ توڑنا کیونکہ اس کا غم نہیں بلکہ مجھے یاد آجاتا ہے کہ کیسے ایک سنگ دل نے میرے شیشہ دل کو توڑا۔

تا شکوہ غیر کا نہ کروں مجھ سے کہتے ہیں کیوں سرگذشت تم کو بھی ہے کوہ کن کی یاد

مجھ سے کہتے ہیں کہ کیا تمہیں فرہاد کی روداد یاد ہے تاکہ میں غیر کی شکایت زبان پر نہ لاؤں

پھر پیرہن کے ہوتے ہیں ٹکڑے برنگ گل پھر مجھ کو آگئی کسی گل پیرہن کی یاد

جب بھی مجھ کو کسی پھولوں جیسے لباس والے کی یاد آتی ہے میں اپنے کپڑے اس قدر پھاڑ ڈالتا ہوں جیسے پھول چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں

ایسے ہی روز گر ستم نو بہ نو رہے تم کو بھلا رہے گی سپر کہن کی یاد

اگر تم ایسے ہی روز نئے نئے ستم کرتے رہے تو تمہیں میری پرانی ڈھال کی یاد کہاں رہے گی

ہے کفر و بدعت ایک نہیں تار سبحہ سے زنار مومن آئے ہے کیوں برہمن کی یاد

ردیف الذال

نامہ رونے میں جو لکھا تو بہے گا کاغذ کہ بنا ہم گہر صفحہ دریا کا غذ

شاعر کہتا ہے کہ اگر رو رو کر خط لکھا تو کاغذ بہنے لگے گا اور بہتا ہوا دریا کی سطح پر اس کے موتیوں کے ساتھ ساتھ چلے گا

اس کے کوچے سے چلا آئے ہے اڑتا کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا کیا مرے خط کا کاغذ

محبوب کے کوچے سے کاغذ اڑتا ہوا آتا دیکھ کر شاعر کہتا ہے کہ یہ کیوں؟ کیا اس نے میرا خط پھاڑ کر پھینک دیا جو اڑ رہا ہے۔

کیا جواب آئے کہ کثرت سے خطوں کے میرے کیمیا یاب سیاہی بنی عنقا کاغذ

میں نے (معشوق کو) اتنے زیادہ خط لکھے کہ اب روشنائی اور کاغذ نایاب ہو گئے۔ تو پھر خطوں

کا جواب کیسے لکھا جائے اور کیسے آئے

سب نوشتے ترے اغیار کو دکھلاؤں گا جانتا ہے تو مرے پاس ہیں کیا کیا کاغذ

تمش نے معشوق سے کہتے ہیں کہ تم کو معلوم ہے کہ میرے پاس تمہاری کیا کیا تحریریں ہیں، وہ سب کی سب رقیبوں کو دکھاؤں گا۔

لکھ کے بدمستی غم تا کہ وہ میکش پڑھ لے باندھ دیتا ہوں سر شیشۂ صہبا کاغذ

اس لئے کہ شراب پینے والا غم کی بدمستی سے واقف ہو جائے، اس بدمستی کا حال لکھ کر شیشۂ مے کے منہ پر باندھ دیتا ہوں۔

مشق کرتے ہیں وہ کیوں لفظ نظر بازی کی پردہ دیدۂ مشتاق ہے یہ یا کاغذ

کاغذ پر بار بار لفظ ''نظر بازی'' کی مشق کیوں کی جارہی ہے، یہ تو اپنی دید کی خواہش کی گویا آڑ ہے۔

رنگ اڑ جانے کا احوال اسے لکھنا ہے
زردی رخ سے زرافشاں میں کروں گا کاغذ

میں خط کے بجائے کاغذ اپنے چہرے سے لگا کر زرد کر کے بھیجوں گا تا کہ اس کو بتا سکوں کہ میرا رنگ کیسا پیلا ہو گیا ہے۔

وصف لکھوں میں تری آنکھوں کے ڈوروں کا اگر رنگ گل خامہ دے اور نرگس شہلا کاغذ

اگر مجھے تیری آنکھوں کے ڈوروں کی صفت بیان کرنا ہو جو سونے کے بعد پڑ جاتے ہیں تو گلاب اور اس کا رنگ بطور قلم اور نرگس بطور کاغذ استعمال کرنا چاہئے۔

ہوگیا اس لب لعل دور دنداں کے سبب نسخہ نسخۂ اکسیر مسی کا کاغذ

جس کاغذ میں مسی آئی تھی اس کو لگانے والے کے لعل جیسے ہونٹوں اور موتی نما دانتوں نے نسخہ اکسیر بنادیا۔

ضد یہ ہے خط سے مرے تاؤ ہزاروں کھائے دست اغیار میں بھی اگر کبھی دیکھا کاغذ

معشوق کو میرے خط سے اتنی کد ہے اگر رقیبوں کے ہاتھ میں بھی کبھی اسکو دیکھ لیا تو بے تحاشہ

مشتعل ہوگیا۔

یاں تلک تو ہوں سیہ کار کوئی پڑھ نہ سکا حشر میں جب میرے اعمال کا کھولا کاغذ

میرے اعمال کا یہ حال ہے کہ جب حشر کے دن میرا نامہ اعمال کھولا جائے گا تو کوئی اس کو پڑھ نہ سکے گا کیونکہ اس میں کالک ہی کالک پھیلی ہوگی۔

قبر میں چھوٹے عذاب دل بیتاب سے ہم نام جب لکھ کے ترا سینہ پہ رکھا کاغذ

قبر کا عذاب مشہور ہے مگر شاعر کو دل کا ڈر اور دل کا عذاب تھا جب اس نے معشوق کا نام لکھ کر اپنے سینے پر رکھا تو اس عذاب سے نجات ملی۔

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

مومن کہتے ہیں کہ ان کی غزلوں میں اس قدر قرب ہے کہ غزل سرا کے بجائے مرثیہ پڑھتے معلوم ہوتے ہیں۔ جو سنتا ہے رو دیتا ہے۔

ردیف الرائے

نہ کیونکر بس موا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

تیری یاد سے میری جان نکلی جاتی ہے جس طرح تو مسکرا کر منہ ہی منہ میں مجھے کچھ کہتا تھا وہ سب بار بار یاد آتا ہے

کہاں لخت جگر ہیں سیل گریہ میں چڑھا دریا
چلے آتے ہیں یہ ڈوبے ہوؤں کے لاشے بہ بہ کر

میرے آنسوؤں سے ایسا سیلاب آیا کہ اس میں ڈوبنے والے انسانوں تک کہ لاشیں بہ کر آرہی ہیں۔ تو ایسے میں میرے کٹے ہوئے کلیجے کے ٹکڑوں کا کہاں پتہ چلے گا۔

بہار باغ دو دن ہے غنیمت جان اے بلبل ذرا ہنس بول لے ہو زمزمہ پرداز چہ چہ کر

کسی نوخیز سے کہہ رہے ہیں کہ زندگی کی بس کچھ ہی عرصہ کی بہار ہے جتنا چاہے ہنس بول لے۔ پرندے کی طرح نغمے گائے اور باتیں کرے۔

نوید اے دل کہ رشکِ غیر سے چھوٹے اسے ہم نے
ستم کا کردیا خوگر جفا وجور سہ سہ کر

اپنے آپ کو خوشخبری دے رہے ہیں کہ ہم نے مسلسل ظلم وستم برداشت کر کے رقیب کو بھی اس کا عادی بنادیا۔لہٰذا اب اس کی جلن کا شکار نہیں ہونا پڑے گا۔

ستم ہے شدت گریہ سرایت خوں نے کی پر کی
رکھے رومال چشم خونفشاں پر لاکھ تہ تہ کر

ظلم وستم سے اس قدر رقت ہوئی کہ بار بار رومال تہ کر کے آنکھوں رکھنے کے باوجود ان سے خون آتا ہی رہا بار بار۔

لگی ہچکی ہے سرزانوئے غم پر ہے کہ یاد آیا کسی کا ہاتھ ہر دم مارناز انو پہ قہ قہ کر

اسے وقت جب موت کی ہچکی آرہی ہے اور سر کو کسی زانو کا سہارا ہی نہیں سوائے اپنے غم کے ایسے وقت بھی کسی کی یاد آرہی ہے کہ وہ کیسے ہر وقت ہنس ہنس کر زانو پر ہاتھ مارتا تھا

خدا کو مان اپنی راہ لے کعبہ کو جا مومن
صنم خانہ میں کیا لیوے گا اے گم گشتہ رہ رہ کر

مومن اپنی آڑ میں دوسروں کو مشورہ دے رہے ہیں کہ خدا سے لو لگا کر کعبہ کی راہ لیں۔صنم خانے میں یعنی حسینوں کے بیچ گمراہ رہ کر کیا ملے گا۔

☆☆☆

اے تند خو آجا کہیں تیغا کمر سے باندھ کر کن مدتوں سے ہم کفن پھرتے ہیں سر سے باندھ کر

شاعر بدمزاج معشوق سے کہہ رہا ہے ایک بار سیدھے قتل کرنے کے لئے خنجر لیکر آجائے ہم تو مدت سے مرنے کے لئے تیار ہو کر اپنا کفن سر سے باندھے ہیں۔

یا وہ ڈبوئے گا زمیں یا ہم ڈبوئیں گے فلک
آئے تو روتے ہیں ہم شرط ابر ترسے باندھ کر

اپنے آنسوؤں کو لامتناہی بارش سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں، اگر ایسا بادا ئے تو ہم اس سے شرط باندھ کر روتے ہیں، یا تو وہ زمین کو غرق کردیگا یا پھر ہم اپنی آہوں سے جوان آنسوؤں کے ساتھ آسمان پر جائیں گی آسمان کو ڈبو دیں گے۔

خط میں تو لکھ سکتا نہیں احوال سوز دل اسے
پر بھیج دوں جی میں ہے پروانے سے پر باندھ کر

دل جلن کا حال خط میں تو ناقابل بیان ہے مگر سوچتا ہوں پروانے کے پر سے باندھ کر اسکو بھیج دوں۔

دشمن سگ کوچہ نہو اس شوخ آہو چشم کا
نادم ہوں کعب گرگ پائے نامہ سے پر باندھ کر

ہے سرخ پٹکا اور خون غیر میں رنگا ہوا
کیا قتل پر میرے کمر نکلے ہو گھر سے باندھ کر

شاعر کا محبوب سرخ دوپٹہ جو رقیب کے خون میں رنگا ہے کمر سے باندھ کر آیا ہے اس سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا میرا قتل کرنے کا تہہ کر کے نکلے ہو۔

آ جھانک تو بھی تو کہیں بے دید کیسی ٹکٹکی بیٹھے ہوئے ہیں رازن دیوار ودر سے باندھ کر

جراح کیا سوچا بتا کیا رنگ دیکھا کیا ہوا کیوں کھول پٹی مرے زخم جگر سے باندھ کر

عاشق کے کلیجے کے زخم کا جو حال ہوا جراح نے اس کو دیکھ کر پٹی کھولنے کے بعد فوراً دوبارہ باندھ دی اس سے سوال کرتے ہیں آخر ایسا کیا دیکھا

دیوانہ نازک ہوں میں فصد و مژگاں نیشتر
لے فصد میرے ہاتھ کو تار نظر سے باندھ کر
مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لئے یہ زور شور
کیا کیا مضامین لائے ہم کس کس ہنر سے باندھ کر

مومن حریفوں کی طرف سے کہہ رہے ہیں کہ اس کوشش میں کہ مومن سے اچھی غزل ہوجائے ،ہم کیا مضامین لیکر آئے۔اوران کو کتنے ہنر سے ادا بھی کیا۔(مگر بیکار)

☆☆☆

جاتے تھے صبح رہ گئے بیتاب دیکھ کر
طالع ہمارے چونک پڑے خواب دیکھ کر

شاعر کے خوابیدہ ستارے صبح رخصت ہورہے تھے کہ اس کی بیتابی دیکھ کر چونک پڑے اور ٹھہر گئے۔

پایا جودشمنوں نے ترے پاس اعتبار
آنکھیں جو چراتے ہیں مجھے احباب دیکھ کر

جب سے دوست دشمن بن گئے اور تیری قربت حاصل کرلی تب سے یہ احباب مجھ سے آنکھیں چرانے لگے۔

یہ تشنہ کامی نگہ گرم دیکھنا　　حیرت سے رودیا طرف آب دیکھ کر

تو بہ کہاں کدورت باطن کے ہوش تھے　　غش ہوگیا میں رنگ مے ناب دیکھ کر

سرخ شراب کا رنگ ہی دیکھ کر شاعر کے ہوش جاتے رہےتو پھر دل میں کسی کدورت کا کیا سوال۔

اٹھی نہ نعش بھی ترے کوچہ سے بعد قتل
ہم رہ پڑے زمین کو شاداب دیکھ کر

تمہارے کوچے میں ہمارا قتل ہوا اور لاش اٹھی بھی نہیں تھی کہ زمین سرسبز ہوگئی یہ دیکھ کر ہماری روح پر رقت طاری ہوگئی۔

روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہ ہوں　　آنکھیں سی کھل گئیں درنایاب دیکھ کر

مجھ کو حیرانی کیوں نہ ہو کہ وہ میرے حال پر رونے لگے جیسا کبھی نہیں ہوتا تھا(آنکھوں میں) یہ نایاب موتی دیکھ کر میری آنکھیں بے یقینی سے پھٹ گئیں۔

شوق و صال دیکھ کر آیا عدو کے گھر		سوجھا نہ کچھ مجھے شب مہتاب دیکھ کر

چاندنی رات دیکھ کر محبوب سے ملنے کی اتنی بیتابی اور دیوانگی ہوئی کہ کچھ نظر نہ آیا اور عاشق اس کے بجائے رقیب کے گھر کے پہنچ گیا۔

ہے ہے تمیز عشق و ہو کر آج تک نہیں		وہ چھپتے پھرتے ہیں مجھے بیتاب دیکھ کر

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ		کافر ہوا میں دین کے آداب دیکھ کر

مومن اپنے آپ سے کہہ رہے ہیں یہ کیا کہ جلوہ دیکھنے کا تقاضہ کر دیا جو کہ کفر کے مترادف ہے۔ تیرے تاب و برداشت کا یہ حال ہے خود ہی جواب دیتے ہیں کہ دین کے ساتھ جو آداب وابستہ کر دیئے گئے ہیں انہوں نے مجبور کر دیا ہے۔

☆☆☆

یاد اس کی گرمی صحبت دلاتی ہے بہار		آتش گل سے مرسینہ جالتی ہے بہار

جب بہار آئی ہے اور ہر طرف پھولوں کے کھلنے سے آگ جیسا منظر تو میرا سینہ جل رہا ہے کیوں کہ معشوق کے قربت کی گرمی یاد آ رہی ہے۔

کوہ وصحرامیں لئے فرحت پھراتی ہے بہار		میں تو کیا ان کو بھی دیوانہ بتاتی ہے بہار

پہاڑ ہوں یا صحرا بہار ہر طرف تازگی کی لہر سے میرے ساتھ ساتھ ان سب کو دیوانہ بنا رہی ہے۔

کھل چکی نرگس کہ شرماتی ہی جاتی ہے بہار
دیکھ کر اس کی بہار آنکھیں چراتی ہے بہار

نرگسی آنکھوں والی بہار یعنی محبوب کو دیکھ کر اصل بہار شرماتی اور آنکھیں چراتی جا رہی ہے۔

جلوہ ٔ لالہ رقیبوں کو دکھاتی ہے بہار
داغ کھانے پر مرے کیا داغ کھاتی ہے بہار
آمد آمد ہے چمن میں کس سمن اندام کی

سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ہے بہار

سمن کی طرح ہولے ہولے جو آرہا ہے بہار اسکے لئے سبزے کا مخمل بچھا رہی ہے

خاک تو مرغ گلستاں کو خزاں ہی نے کیا

دیکھئے اب آن کر کیا خاک اڑاتی ہے بہار

پہلے ہی خزاں نے چمن کے پرند کو جلا کر خاک کر دیا، دیکھو اب آکر بہار کیا کر لیتی ہے سوائے خاک اڑانے کے۔

ہے خزاں میں بھی وہی جوش جنوں کیا ہوگیا

اب کہیں پاس اپنے ہم کو ہی بلاتی ہے بہار

یہ عجیب بات ہے کہ خزاں میں بھی ہمارا جنون ویسا ہی ہے جیسا پہلے بہار میں تھا۔ اب بہار نہ جانے کہاں پہنچ کر وہاں سے ہم کو ہی اپنے پاس بلا رہی ہے اس لئے یہ جوش جنوں ہے۔

جوش گل سے یاد آتی ہیں تری رنگینیاں

رنگ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ہے بہار

موسم بہار میں پھولوں کے کھلنے سے تیری رنگین ادائیں یاد آتی ہیں اس کی وجہ سے میرے اڑتے ہوئے رنگ کے ساتھ ساتھ بہار کا رنگ چڑھ رہا ہے۔

داغ اور زخم اس میں ہیں جو لالہ وگل اس میں ہیں

فصل ہے یا آپ کے عاشق کی چھاتی ہے بہار

بہار کا منظر کچھ ویسا ہی ہے جیسا تمہارے عاشق کا سینہ کیوں اس میں جو پھول ہیں، لالہ وگل ہیں وہ سرخ سے بھرے ہیں۔

امتیاز دل دہی و دلبری میں فرق ہے

تم کو بھاتی ہے خزاں اور ہم کو بھاتی ہے بہار

جس طرح دل کو تسلی دینے اور دل دینے میں فرق ہے ویسے ہی یہ فرق ہے کہ تم خزاں اور ہم کو بہار

اچھی لگتی ہے۔

محو حیرت کو وصال و ہجر دونوں ایک ہیں
بلبل تصویر کو کب یاد آتی ہے بہار
میری ضد سے غیر پر تیری عنایت دیکھ کر
سبزہ بیگانہ کے قربان جاتی ہے بہار
ابتدائے فصل ہی میں غیر بھی کھاتے ہیں گل
دیکھیے اس سال کیا کیا گل کھلاتی ہے بہار
چشم گل پر قدم رکھتا ہوا کو آئے گا
عطر فتنہ میں گل نرگس بسا تی ہے بہار
خندۂ دیوانگی یاں بعد مرون بھی رہا
خاک سے لگتے ہیں گل ان کو ہنساتی ہے بہار
کچھ سوائے گر یہ جوں ابر اپنی قسمت میں نہیں
زعفراں ہی کیوں ہو مجھ کو رلاتی ہے بہار
غنچہ ہائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار

❁❁❁

ڈاکٹر تبسم شاداب

شبلی نعمانی کی خطوط نگاری

بیسویں صدی بڑی تبدیلیوں کی صدی رہی ہے۔ اس صدی میں ان لوگوں کے ادبی کارنامے ظہور پذیر ہوئے جنھوں نے اس صدی کے سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات کو محسوس کیا اور انھیں اپنے فکروخیال کا وسیلہ بنا کر اپنے خطوط میں بے لاگ انداز میں پیش کیا، اردو ادب کی رومانی تحریک کے اثرات اس دور کے بہت سے ادیبوں نے قبول کیے۔ انھیں لوگوں نے دور سرسید میں نئی شاعری اور نئی نثرنگاری سے متعلق یادگار زمانہ کارنامے انجام دیے۔ علامہ شبلی کے خطوط رومانی انشاپردازی کی فہرست میں شامل کیے جاسکتے ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی جدید اردو نثر کے بانی و معمار اور سرسید احمد خاں کے ممتاز رفیقوں میں تھے۔ سرسید کے اثر میں آنے کے بعد ہی شبلی نعمانی نے وہ کتابیں لکھیں جو اردو ادب کی جان ہیں۔ وہ سرسید تحریک کے روح رواں اور بڑے علم بردار تھے۔

علامہ شبلی نعمانی جس طرح اردو کے قد آور نقاد اور سوانح نگار ہیں، اسی طرح اردو مکتوب نگاری میں بھی انھیں بلند اور منفرد مقام حاصل ہے۔ غالب نے اردو مکتوب نگاری میں جس طرز کی بنیاد رکھی وہ انھیں کی شخصیت کا جز بن کر رہ گئی، اسی طرح شبلی کے خطوط کی خصوصیات بھی کسی اور میں پیدا نہ ہوسکیں۔ شبلی کے خطوط میں روانی، سلاست، دلکشی اور اختصار ہے۔ شبلی کی تحریروں کی سب سے نمایاں خوبی ایجاز واختصار ہے۔ شبلی کے مکاتیب پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

> ''سرسید کا دور اپنے بے تکلف انداز بیان کے لیے امتیاز رکھتا ہے۔ طرز بیان میں خاص لطیف روح اگر کہیں جلوہ گر ہے تو شبلی کے خطوط ومکاتیب میں۔ ایجاز یوں بھی شبلی کی تحریر کا خاصہ ہے۔ مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے، اس کو جانِ ایجاز ہی کہا جاسکتا ہے۔ ان کی مکتوب نگاری فرصت اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں، ان کا ہر خط

کسی جمیل یا جزیل مقصد سے وابستہ ہے۔ ان کے خطوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی اہمیت جانتے تھے اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ لہٰذا زندگی کا ایک لمحہ بھی ان کے نزدیک رائیگاں نہیں۔ اس نقطہ نظر سے شاید ان کے خط کا ایک لفظ بھی بیکار اور بے ضرورت نہیں۔''

(وجہی سے عبدالحق تک سید عبداللہ، مکتبہ خیابانِ ادب لاہور۔ ۱۹۷۷ ۹۹۔۲۹۸ع)

شبلی نعمانیؒ کے متفرق خطوط رسائل و کتابوں کی زینت ہیں لیکن باقاعدہ شبلی کے خطوط کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں:

(۱) مکاتیب شبلی: مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبع شاہی لکھنؤ، حصہ اول، ۱۹۱۶ء۔

(۲) مکاتیب شبلی: مرتبہ سید سلیمان ندوی، حصہ دوم، طبع اول، ۱۹۱۷ء، مطبع معارف اعظم گڑھ۔ مکاتیب شبلی کے دونوں مجموعے دوسری بار مطبع معارف اعظم گڑھ سے پہلا حصہ ۱۹۲۸ء میں اور دوسری حصہ ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئے۔

(۳) خطوط شبلی: مرتبہ محمد امین زبیری۔ پہلی بار یہ مجموعہ لاہور سے ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔

خطوط شبلی، دوسری بار وہ مجموعہ جس کو محمد امین زبیری نے مرتب کیا۔ ۱۹۶۶ء میں آگرہ سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے دو حصے ہیں۔ حصہ اول جس میں خطوط بنام عطیہ فیضی جس میں ۵۵ خطوط شامل ہیں اور جو ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۱ء کے عرصے پر محیط ہیں۔ حصہ دوم میں زہرا بیگم کے نام خطوط کی تعداد ۴۷ ہے۔ یہ ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء کے عرصہ پر محیط ہیں۔ یہ مجموعہ ۱۲۳ صفحات پر مشتمل ہیں۔

(۴) علامہ شبلی کے کچھ خطوط ''باقیات شبلی''، مرتبہ مشتاق حسین، میں بھی شامل کیے گئے ہیں جو اور کسی مجموعے میں نہیں ملتے۔ اب یہ مجموعہ کمیاب ہے۔

جو خطوط علامہ شبلی نعمانی نے اپنے دوستوں، بزرگوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں، ان کی نمایاں صفت ان کا ایجاز و اختصار اور خلوص ہے۔ یہ ایجاز و اختصار محاورات، تشبیہات، استعارے و مجاز نیز کنایہ اور جگہ جگہ مبالغہ کی شمولیت سے اپنا الگ رنگ لے کر سامنے آتا ہے۔ عبارت کا حسن غزل کے اشعار کا لطف دینے لگتا ہے۔ شبلی کے خطوط میں جو اختصار ملتا ہے اس کی وجہ سے بقول

سید سلیمان ندوی'' ان کی بیوی مختصر خط کو'' تار'' کہا کرتی تھیں۔(مکاتیب شبلی، حصہ اول۔۱۹۱۶
مطبع شاہی لکھنوص ۸) نہایت مختصر لکھتے تھے، کبھی کبھی صرف ''ہاں ناں'' پر اکتفا کرتے۔ مفصل
اور طویل سوالوں کے جواب بھی وہ ایک فقرے میں دیتے۔ شبلی کے ایجاز کی مثال ملاحظہ فرمائیں:

''اس قدر دشمن ارباب وفا ہوجانا''

شبلی، ۱۰؍ مئی ۱۹۱۱ء، لکھنؤ'' (خط بنام ابوالکلام آزاد۔۱۰ مئی ۱۹۱۱ لکھنو)

اس ایک مصرعی خط نے ہزاروں شکوؤں کا نچوڑ پیش کردیا جس میں کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ مکتوب الیہ سے بے تکلفی اور قربت کا احساس دلاتا ہے۔

شبلی کے ابتدائی خطوط میں کسی قدر طوالت بھی ملتی ہے۔ شروع کے خطوں سے ذہن قدرتی طور پر علی گڑھ اور اس کی مخصوص فضا کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ شبلی جدید تعلیم کے اثرات اور نتائج سے مطمئن نہیں تھے۔ علی گڑھ پہنچنے کے کچھ دنوں بعد ہی اپنے ایک عزیز شاگرد مولوی محمد سمیع کو علی گڑھ کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہاں آکر میرے تمام خیالات مضبوط ہوگئے۔ معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں۔ یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا۔ بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کردیں گے لاحول ولاقوۃ وہ لوگ تو زمین کی حرکت بھی سمجھ نہیں سکتے۔ سید صاحب نے اکثر مجھ سے فرمایا کہ ہندوستان کے تمام انگریزی تعلیم یافتہ مسلمانوں میں ایک بھی ایسا نہیں جو کسی مجمع میں کچھ کہہ سکے یا لکھ سکے۔ صرف تین شخص کو مستثنیٰ کرتے تھے وہ فرماتے ہیں کہ انگریزی ان کے دماغوں میں کچھ تبدیلی پیدا نہیں کرتی۔'' (مکاتیب شبلی، حصہ اول، ۵۰۰۵۱)

سر سید احمد خاں اور علی گڑھ نے شبلی کی شخصیت کو نکھارا لیکن شبلی کو مذہبی اور سیاسی معاملات میں سر سید احمد خاں سے اختلاف تھا۔ سر سید کو بھی شبلی سے اختلاف رائے تھا مگر دونوں نے اس بات کا

اظہار کبھی نہیں کیا۔ صرف ''الفاروق'' کے بارے میں سرسید نے شبلی کو یہ کتاب نہ لکھنے کی رائے دی تھی۔ شبلی جدید تعلیم کے خلاف نہیں تھے، وہ چاہتے تھے کہ طالب علم مشرقی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی کی تعلیم بھی حاصل کریں۔ شبلی جب ندوہ (مدرسہ ندوۃ العلوم) میں تھے تو ایک طالب علم ضیاء الحسن انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے لیے علی گڑھ میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ اپنے شاگرد مولانا ضیاء الحسن کو لکھتے ہیں:

> ''میاں ضیاء الحسن علی گڑھ کالج میں تعلیم کے لیے جاتے ہیں۔ تم کو ایک خط ان کی معرفی کا ڈاکٹر ہارویز کے نام لکھ کر میرے پاس بھیج دو۔ میں ان کو بھیج دوں گا۔''
>
> (مکاتیب شبلی، حصہ دوم، اعظم گڑھ۔ ۱۹۲۷)

مدرسۃ العلوم علی گڑھ سے شبلی کا تعلق، ان کی تغیر پذیر شخصیت، ان کے بدلتے ہوئے مزاج کا عکس ان کے خطوط میں پوشیدہ ہے۔ سرسید سے شبلی نعمانی کی کس طرح بنی اور کیونکر بگڑی، علی گڑھ کا قیام، سرسید کے کتب خانے سے استفادہ اور دیگر حالات کا علم شبلی کے خطوط سے ہوتا ہے۔ شبلی کا خیال تھا کہ جدید تعلیم مسلمانوں کو مذہب سے دور کر رہی ہے لیکن جب علی گڑھ کے طلبہ نماز اور روزے کے پابند ہوتے ہیں تو حکیم محمد عمر کے نام ایک خط میں اپنی خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

> ''اس وقت نہ مجھ سے میری طبیعت کا حال پوچھئے، نہ کوئی اور واقعہ آپ سنیے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں۔ یوں تو مدرسۃ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں، مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے۔ لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو وہ بخت الصلوٰۃ کہتے ہیں، ایک بی اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں۔ چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوں لوگوں کو اس پر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے ''الصلوۃ خیر من النوم'' پانچوں وقت کی نمازیں باجماعت ہوتی ہیں، اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش سے، بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں۔'' (مکاتیب شبلی۔ بنام محمد عمر۔ ۱۸۸۶)

شبلی نعمانی نے اسلامی ممالک کی سیر کا منصوبہ بنایا اور مسٹر آرنلڈ کے ساتھ سفر پر روانہ ہوئے۔

دوران سفر مسٹر ارنلڈ یوروپ چلے گئے اور شبلی بیروت، سائبیریا کا سفر کرتے ہوئے ۲۳ رمئی ۱۸۹۲ء کو قسطنطنیہ پہنچے۔ اس سفر سے شبلی کا اصل مقصد قدیم کتابوں کا مطالعہ تھا۔ شبلی نے وہاں کے کتب خانوں اور ہر نادر کتب کا مطالعہ کیا۔ کتب خانوں کے علاوہ شبلی وہاں کے مدارس اور طرزِ تعلیم سے بہت متاثر ہوئے۔ شبلی کو مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا ہر لحظہ خیال رہتا تھا۔ قسطنطنیہ سے سر سید احمد خاں سے خط وکتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک خط میں سر سید کے مدرسۃ العلوم کو ایک خاص رنگ دینے کے لیے قومی لباس کا مشورہ دیتے ہوئے شبلی لکھتے ہیں:

> ''یہاں کے کالجوں کی ایک بات مجھ کو بہت پسند آئی کہ ہر کالج کا خاص لباس ہے اور کوٹ پر گریبان کے قریب کالج کا نام لکھا ہوتا ہے۔ مجھ کو یہ بات نہایت پسند ہوئی۔ ہمارے کالج میں یہ طریقہ کیوں نہیں اختیار کیا جاتا۔ سید صاحب قبلہ بغیر کسی پس وپیش کے کالج کا ایک خاص لباس قرار دیں تو بہت اچھا ہوگا۔'' (خط بنام عجیب اللہ۔ ۵ جون ۱۸۹۴)

علامہ شبلی کے خطوط علمی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ جب ہندوستان کے مشہور کتب خانوں سے ان کی پیاس نہ بجھی تو انھوں نے قسطنطنیہ کا سفر کیا۔ وہاں کے کتب خانے انھیں علوم وفنون کے عجائب خانے لگے۔ ایک خط میں سر سید کو لکھتے ہیں:

> ''کتابیں یہاں عجائب وغرائب ہیں لیکن حیرت کے سوا کچھ حاصل نہیں نہ نقل ہو سکتی ہے نہ حافظہ ان کے لیے کافی ہے۔ ہر روز دو تین میل پیادہ پا سفر کرتا ہوں کیونکہ کتب خانے دور دور واقع ہیں۔'' (خط بنام سر سید احمد خاں۔ ۱۸۹۴)

مولانا شبلی کے ابتدائی خطوط سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھیں سر سید کا کس قدر پاس تھا اور یہ سر سید کی عظمت کا ثبوت ہے کہ انھوں نے شبلی جیسے نوجوان کی ہمت افزائی کی بلکہ اس سے استفادہ کرنے میں بھی مطلق نہیں شرمائے۔ اس طرح مولانا کے حوصلے بلند ہوتے گئے اور ان کا مطالعہ گہرا اور مقبولیت کا دائرہ روز بروز وسیع ہوتا گیا۔ مولانا سر سید کے کتب خانے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"تصانیف کا شوق ابتداً مجھ کو تاریخی تصانیف کے دیکھنے سے ہوا تھا۔ جو یوروپ میں چھپی ہیں اور ایک موقع پر بہت ساری کتابیں مجھ کو یکجا ملی تھیں جن کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔"
(مولانا شبلی نعمانی۔ایک مطالعہ۔مفتون احمد۔مکتبہ اسلوب، کراچی ۱۹۸۶۔ص ۱۰۲)

شبلی کے خطوط ان کی سیرت و شخصیت، جذبات و خیالات، احساسات و رجحانات اور اعمال و افعال کی صحیح معنی میں عکاسی کرتے ہیں۔ انداز میں شوخی اور طرزِ اظہار میں بے باکی اور بے ریائی ہے اور قدم قدم پر قومی و ملّی خدمات کا جوش اور جذبہ نمایاں ہے۔ ان کے خطوط کے بارے میں خورشید الاسلام نے لکھا ہے:

"شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہیں۔ ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلوؤں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہر حال ان خطوط میں ندوے کے نقوش ہیں۔ سیرت پر مکالمات ہیں۔ شعرالعجم کے مباحث پر گفتگو ہے، نادر کتابوں کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے۔ تبصرے ہیں تنقیدی اشارات ہیں۔ دوستوں کی سرگوشیاں ہیں، عزیزوں کی سفارش ہے، اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو روح و بدن کو مخمور کیے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔" (شبلی نقادوں کی نظر میں۔ناز صدیقی۔الیاس شاہ علی، بنڈہ، حیدر آباد۔۱۹۷۶۔ص ۵۵)

خطوطِ شبلی کی اسلوب کی ایک نمایاں صفت عبارتوں کا خوبصورت اتار چڑھاؤ بھی ہے جس کی اہم وجہ شبلی کے مزاج کی رومانیت اور ان کا وہ انداز جو ایک خطیب کے بجائے ایک شاعر کا نرم و نازک لب و لہجہ ہے جس میں فضیلت اور علمیت کے ساتھ شبلی کے ادبی و شعری احساسات اور انسانی جذبات کو بھی بڑا دخل ہے۔ جملوں کی بناوٹ استعارات و تراکیب سے آراستہ ہے۔ اس کی وجہ ان کا ذوقِ جمال تھا جس نے ان کے خطوط میں نثری شاعری کی تصویر جمیل پیش کردی۔ خطوط میں جملوں کے ترتیبی آہنگ سے شعریت ٹپکتی ہے اور صوتی آہنگ کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

خطوط نگاری میں شبلی کا کوئی متعین اسلوب نہیں تھا بلکہ مخاطب کے معیار و مذاق سے مطابقت [illegible]

کا طرزِ بیان بدلتا رہتا تھا۔ کبھی مفصل خط لکھتے تو کبھی ایک دو جملوں پر ہی اکتفا کر لیتے تھے۔ القاب و آداب کی پروا کیے بغیر مدعا بیان کر دیتے تھے۔

خطوطِ شبلی کی عبارت کی خوبی اشعار کے انتخاب اور ان کی پیش کش سے بھی وابستہ ہے جس سے ان کا اسلوب اور زیادہ دلکش اور جاندار ہو جاتا ہے۔ فارسی و عربی کے مصرعے والفاظ ان کے شگفتہ و رواں دواں اسلوب کے حسن میں چار چاند لگا دیتے ہیں اور نثر میں محاکات نگاری اور سہل ممتنع کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اپنے دوست اور ساتھی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے اعظم گڑھ پہنچنے کی خبر سن کر خوشی کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''کیا آپ واقعی جلوہ فرما ہوں گے اور کیا حقیقت میں میرے ویرانے میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی۔ نامہ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں ''سچ سچ بتا یہ صرف انھیں کے قلم کے ہیں۔'' (خط بنام حبیب الرحمٰن خاں شیراونی۔ دسمبر۱۸۹۹)

علامہ شبلی نعمانی ندوے کے بانیوں میں سے تھے۔ علی گڑھ میں جدید تعلیمی علوم اور انگریزی کا غلبہ ان کی ناگواری کا سبب بنا اور انھوں نے ندوہ میں سکونت اختیار کر لی۔ ندوہ کو ایک مثالی تعلیمی ادارہ بنانے کے لیے انھوں نے ہر ممکن کوشش کی۔ مولانا شبلی ندوے کی دینی اور روایتی تعلیمات کے نصاب کو چند خاص عربی کتب اور انگریزی سے مرقع کرنا چاہتے تھے اور اپنے اسی طرزِ فکر کی وجہ سے ندوے کے علما سے ان کے اختلافات پیدا ہو گئے جس کے نتیجے میں شبلی نے ندوہ سے علاحدگی اختیار کر لی اور اعظم گڑھ چلے گئے۔ خطوطِ شبلی میں ندوہ کا اتنا ذکر موجود ہے کہ ان سے نہ صرف اس عہد کے ندوہ کی صورت حال کا علم ہوتا ہے بلکہ وہ تنازعات اور بحثیں بھی واضح ہو جاتی ہیں جن سے شبلی کو دو چار ہونا پڑا۔ ان خطوط سے شبلی کی مایوسی، جذبات اور طنز کا اندازہ ہوتا ہے۔ ندوہ سے متعلق خط سے ایک مثالیں ملاحظہ کیجیے:

''باوجود اس کے کہ میں کمیٹی سے خارج رکھا گیا ہوں۔ رسالہ میں مجھ کو دخل نہیں تو کیا مجھ سے دعا گوئی اور طلبا نوازی کا کام لینا مقصود ہے۔ مجھ کو پسند نہیں کہ ایک مذہبی مجلس

میں شریک ہوکر جوڑتوڑ کروں اپنااثر بڑھاؤں اورمخالف کوشکست دوں۔ اس جنت سے دوزخ بھلی اس مردی سے نامردی بہتر۔ مجبی! ہم مسلمانوں کی فطرت خدانے بالکل تباہ کردی ہے۔آپ کیاکریں گےاورکوئی کیاکرے گا۔جس کا جی چاہے سکریٹری مددگارناظم وغیرہ وغیرہ بن لے اور اس عزت پراترالے، باقی کام ہونایہ تو قسمت ہی میں نہیں پھرکیافائدہ۔"
(مکاتیب شبلی۔حصہ اول۔"ط۲۰مئی۱۹۰۱۔ص۱۳۴)

ادب اورتنقید کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہرادبی کاوش کے ساتھ ساتھ کسی نہ کسی حدتک تنقیدی شعور لازمی ہے۔مولانا اس تنقیدی شعور کی وجہ سے دوسروں کی تصنیفات کا ہی نہیں بلکہ اپنی کا بھی غیر جانب داری سے جائزہ لیتے ہیں۔ کیونکہ خطوط شبلی میں ادبی نکات اور تنقیدادب کے متعلق بھی مواد ملتا ہے اس لیے خطوط کے مطالعے سے شبلی کے عمیق مطالعہ اور گہری سوجھ بوجھ اور سلجھے ہوئے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

"خیام کی یوروپ نے قدر کی،لیکن اگروہ سحابی استرآبادی سے واقف ہوتے تو جس کی دس ہزار فلسفیانہ رباعیاں موجود ہیں توان کی اوربھی آنکھیں کھلتیں کئی سو رباعیاں اس کی میرے پاس موجود ہیں کبھی سنیے گا۔" (خط بنام مہدی افادی۔از۔حیدرآباد)

مولاناشبلی کے خطوط علمی وادبی تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں۔علم الکلام کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

"میں نے علم الکلام نہایت ناتمام کتاب لکھی اور درحقیقت میری تصنیفات کا سب سے ناقص حصہ ہے۔" (مولاناشبلی۔ایک مطالعہ ص۱۰۹)

۱۸۸۳ء میں جب شبلی علی گڑھ آئے تو سرسید کی رفاقت، کالج کے طلبا اور اساتذہ کے درمیان رہنے اوربسنے کے مواقع فراہم ہوئے تب اردوشاعری میں بھی بااعتبار کیفیت وکمیت اضافہ ہونے لگا۔علی گڑھ کے ابتدائی دور میں وہ بحیثیت شاعر نمایاں رہے۔اردوشاعری کی نسبت انھوں نے اپنے خطوں میں زیادہ اظہارِخیال نہیں کیا ہے۔غالب کی طرح وہ بھی اپنی فارسی شاعری کو ہی پسند کرتے تھے اور اردوشاعری کو محض تفریح طبع یا قومی ضرورت کے تحت رکھتے تھے لیکن آزاد اور حالی

کی موضوعاتی نظمیں انھیں متاثر کرنے لگیں۔ اس دور کے خطوط میں ان کی بعض اردو غزلیں نظر آتی ہیں۔ انھیں خطوط میں بعض جگہ انھوں نے اپنی شاعری کے چرچے بھی کیے ہیں۔ ایک خط میں غزل کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''آج کل تنہائی کی وجہ سے گھبراتا ہوں مگر اتنا ہے کہ اس کی بدولت کبھی کبھی کچھ موزوں کر لیتا ہوں۔ رات بیٹھے بیٹھے ایک غزل لکھ ڈالی۔ دو تین شعر مزے کے ہیں تمھیں بھیجتا ہوں۔'' (مکاتیب شبلی۔ خط بنام مولوی سمیع اللہ۔ ص۔ ۵۸)

شبلی نے اپنے خطوط میں پانچ غزلوں کا ذکر کیا ہے۔ وہ غزلیات 'کلیات شبلی' میں شامل نہیں ہیں۔ علامہ شبلی زمانے کی روایت کے برخلاف شاعری میں کسی کے شاگرد نہیں۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا ظفر الملک نے اپنے رسالہ ''الناظر'' لکھنؤ کی کسی اشاعت میں شبلی کو خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی کا شاگرد لکھ دیا تو شبلی نے ان کو ایک خط میں لکھا:

''جناب ایڈیٹر صاحب زاد لطفہ، آپ نے اپنے پرچہ میں لکھا ہے کہ میں خواجہ عزیز الدین صاحب کا شاگرد ہوں، خواجہ میرے مخدوم ہیں لیکن میں ان کا شاگرد نہیں۔ میں نہ شاعر ہوں نہ میں نے کسی شاعر سے اصلاح لی ہے۔ یہ جو کبھی کبھی (کچھ) موزوں کر لیتا ہوں شاعر نہیں تفریح طبع ہے۔'' (مکاتیب شبلی ص۔ ۳۴۱)

شبلی کے تمام خطوط تصنع اور بناوٹ سے پاک ہیں۔ مولانا شبلی ادیب وانشاپرداز تھے۔ خطوط میں دلکشی کا ایک خوبصورت انداز اور تخیل کی آمیزش سے انشاپردازی کی شان نمایاں ہے۔ اگرچہ انشاپردازی کو خطوط نگاری کا نازک فن برداشت نہیں کرسکتا لیکن شبلی کے دلکش اسلوب کی وجہ سے انشاپردازی ان کے خطوط کی دلکشی میں اضافہ کرتی ہے۔ انشاپردازی کا ایک نمونہ ملاحظہ کیجیے:

''آج میں نے عجیب دل آمیز خواب دیکھا۔ عجیب اس لیے کہ دوپہر کا وقت تھا اور آنکھیں بیدار تھیں اور دل آویزی کی یہ کیفیت ہے کہ جاگے ہوئے مدت ہو چکی ہے اور اب تک آنکھوں میں وہی سماں پھر رہا ہے۔'' (خط بنام شیخ حبیب اللہ، ۱۹ جون ۱۸۹۲)

مہدی حسن افادی معاصرانہ ادب اور اس کے تقاضوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ انھیں شبلی

کی ادبی صلاحیتوں کا اعتراف تھا۔شبلی نے مہدی کے نام کم وبیش اسّی خطوط لکھے ہیں جس زمانے میں شبلی شعرالعجم لکھ رہے تھے تو مہدی نے توجہ دلائی کہ آزاد کی تالیفِ موعود پر نظر رکھیے گا۔ جو موضوع مشترک پر نکلنے والی ہے۔ جسے شبلی یہ سمجھے کہ ''سخندان فارس'' کی طرف اشارہ ہے جب حقیقت کا علم ہوا تو شبلی لکھتے ہیں:

''آزاد کی کتاب آج آئی۔ جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں۔ تاہم وہ ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا تو وحی معلوم ہوتا لیکن خدا شکر ہے کہ گیارہ لیکچر تک اس نے میری سرحد میں قدم نہیں رکھا۔ بارہویں میں یہ میدان میں اترا ہے لیکن زور پہلے ہی صرف ہوچکا تھا اس لیے یوں ہی سرسری چکر لگا کر نکل گیا۔'' (مکاتیب شبلی۔جلد دوم۔ص۔۲۱۲)

لیکن جب مہدی افادی نے انھیں بتایا کہ ان کا اشارہ سخندان فارس سے نہیں بلکہ ''تذکرۂ شعرا'' سے تھا تو شبلی نے مہدی کو لکھا:

''میں آزاد کی طرف سے بالکل مطمئن ہوگیا تھا۔لیکن آپ نے پھر ڈرا دیا مجھے پہلے سے معلوم ہوتا تو اس مضمون پر ہاتھ نہ ڈالتا۔ خیراب تو دل افگندیم،انم (مکاتیب شبلی۔جلد دوم۔ص۔۲۱۲)

شبلی سخندان فارس کے بارے میں بہت فکر مند تھے۔جس کا اندازہ ان کے خطوط میں موجود دلچسپ جملوں سے لگایا جاسکتا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں:

''سخندان فارس حصہ دوم نکلا۔ سبحان اللہ! لیکن الحمدللہ میرے شعرالعجم کو ہاتھ نہیں لگایا ہے۔'' (شبلی کی علمی وادبی خدمات۔خلیق انجم۔ص۔۳۵)

مولانا شبلی کی ''شعرالعجم'' کے علاوہ ''سوانح مولانا روم'' ایسی تصنیف ہے جو تنقیدی اور تحقیقی لحاظ سے ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔'سوانح مولانا روم' شبلی کے سلسلۂ کلامیہ کی چوتھی کڑی ہے جس میں فاضل مصنف نے مولانا روم کی زندگی کے حالات با اختصار مگر مثنوی پر مفصل تنقید وتبصرہ کیا ہے نواب سید علی خاں کو لکھتے ہیں:

''میں آج کل مثنوی مولانا روم پر ایک بڑا مفصل ریویو لکھ رہا ہوں۔''
(مکاتیب شبلی۔ص۔۲۷۷)

مولانا شبلی کو اسلام، اسلامی تمدن، اسلامی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے ذہنی لگاؤ تھا۔ اسلامی سیاست میں وہ عالمگیر اسلامی برادری کے قائل تھے۔ ۱۸۸۶ء میں روس وروم کی جنگ شروع ہوئی۔ عام مسلمانوں کے ساتھ انھوں نے بھی ترکی کی حمایت کی۔ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا کرنے کے لیے پرجوش نظمیں لکھیں، مضامین لکھے۔ ایک صاحب ان کی سیاسی نظمیں چھاپنا چاہتے تھے تو ان کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اگر آپ سیاسی نظمیں شائع کرنا چاہتے ہیں تو ضروری ہے کہ میرے تینوں مضمون سیاسی کروٹ والے بھی شامل کر لیجیے کہ اس نظم کی وہ شرح ہے۔'' (شبلی نقادوں کی نظر میں۔ص۔۹۳)

۱۸۹۷ء میں جب یونان اور روم کی جنگ ہوئی تو وہ علی گڑھ میں تھے اور سرسید کا نقطۂ نگاہ یا ان کی سیاسی پالیسی سے ان کو اندر سے گھٹن محسوس ہونے لگی تھی۔ سرسید احمد خاں کی سیاسی پالیسی کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''رائے میں میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ سولہ سال رہا لیکن پولیٹکل مسائل میں ہمیشہ ان کا مخالف رہا اور کانگریس کو پسند کرتا تھا اور سرسید سے بارہا بحثیں کیں۔''
(شبلی نقادوں کی نظر میں۔ص۔۹۳)

عربی اخبارات میں جو کچھ پڑھتے تھے بیان کر دیتے تھے ایک خط میں مہدی افادی کو لکھتے ہیں:

''ترکی کی جدید زندگی نے ان کے ہواخواہوں کو مخمور کر دیا ہے۔ کیا بتاؤں عربی اخبارات میں آج کل کیا نشر ہوتا ہے۔ سو سو دفعہ پڑھتا ہوں اور سیر نہیں ہوتا۔ آپ کو مبارک ہو کہ آزادی کے جو جلوس نکلے۔ ان میں بیس ہزار کی جمعیت کا ایک کمانڈر ایک جنس لطیف تھی۔'' (شبلی کی علمی وادبی خدمات خلیق انجم ص۔۱۸۳)

خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا جہاں ایک طرف آزادیٔ وطن کے قائل ہیں وہیں دوسری طرف

آزادیٔ نسواں کے بھی حمایتی ہیں۔ اس سے ان کی سیاسی بصیرت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

شبلی کے خطوط کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عورتوں کی عصری تعلیم کے حامی تھے۔ شبلی نہیں چاہتے تھے کہ عورتوں کو صرف امور خانہ داری میں ہی محصور رکھا جائے لیکن لگتا ہے کہ کوئی انھیں پیچھے سے کھینچتا بھی ہے۔ وہ ایک عالم دین تھے اور مولویوں کی بنائی ہوئی فضا نے دیواریں کھڑی کر دی تھیں۔ حبیب الرحمٰن شیروانی کو خط میں لکھتے ہیں:

> ''بمبئی میں عورتوں کے جلسے دیکھے، ان کی تقریریں سنیں، ان کی قابلیت دیکھی لیکن ''چنداں خوشی نہ ہوئی'' کیوں کہ ان سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں پتہ نہ تھا۔''
> (مکاتیب شبلی۔ ص۔ ۵۸)

شبلی نے اپنے ایک خط میں تعلیم نسواں کے نصاب پر بحث کی ہے۔ ان کے دیگر خطوط کے مطالعہ سے بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ تعلیم یافتہ خواتین کی تکمیل کے لیے کن امور کی ضرورت خیال کرتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''عورتوں کے لیے الگ نصاب ہو یہ اصولی غلط ہے۔ جس میں یورپ مبتلا ہو رہا ہے کوشش ہونی چاہیے۔ دونوں صنفوں میں جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے وہ کم ہوتا جائے نہ کہ اور بڑھتا جائے۔ اور بات چیت رفتار گفتار، نشست و برخاست، مذاق زبان، سب الگ ہو جائیں۔ البتہ بعض چیزیں مثلاً رضاعت، پرورش اولاد وغیرہ مضامین عورتوں کے نصاب میں اضافہ ہونے چاہیے۔'' (خطوط بنام عطیہ فیضی۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۹)

علامہ شبلی کے جو خطوط عطیہ فیضی اور زہرا فیضی کے نام ہیں وہ 'مکاتیب شبلی' کے مقابلے میں ایک طور پر انفرادیت رکھتے ہیں۔ 'مکاتیب شبلی' میں شبلی ایک عالم دین، ادیب، فلسفی، سیاست داں، مورخ نظر آتے ہیں۔ 'خطوط شبلی' میں انھوں نے اپنے دلی جذبات کا اظہار کیا ہے۔ خطوط کیا ہیں آپ بیتی ہیں جو مزہ آپ بیتی میں ہے وہ جگ بیتی میں کہاں؟ 'خطوط شبلی' کے خطوط میں بے تکلفی، تعلیم نسواں، موسیقی اور پردہ کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے معاشرتی امور بھی زیر بحث

آئے ہیں۔شبلی کے ان خطوط کوایک خاص روشنی میں دیکھا جائے تو ان کے خطوط کو اردو ادب میں عشقیہ خطوط کا سنگ میل کہا جا سکتا ہے۔لیکن اگر 'خطوط شبلی' کا مطالعہ اس لحاظ سے کیا جائے کہ ان میں کتنی ادبی چاشنی ہے تو انھیں خوبصورت ادبی دستاویز کہنا مناسب ہوگا۔عبدالحق نے 'خطوط شبلی' پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''یہ دلی جذبات وخیالات کے نقوش ہیں جو بے ساختہ قلم سے ٹپک پڑے ہیں بے ریائی اور خلوص کی سچی تصویریں ہیں جن کے ادا کرنے میں ادبی تکلفات اور انشاپردازی کے داؤ پیچوں سے مطلق کام نہیں لیا گیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ پڑھنے والوں کے دل لبھائیں گے اور ان کے شوق کو تازہ رکھیں گے۔'' (خطوط شبلی۔مرتبہ محمد امین زبیری ومنشی سید محمد یوسف۔ص ۲۶)

خط لکھتے وقت بعض صورتوں اور بعض رشتوں میں مصلحت اندیشی در آتی ہے اور خط لکھنے والا وہ باتیں تحریر نہیں کرتا جو اس کے ذہن ودل کی ترجمانی کرتا ہو بلکہ وہ ان باتوں کو ترجیح دیتا ہے جو مکتوب الیہ سے اس کے رشتے کے تناظر میں موزوں، مفید اور حسب حال ہو۔عطیہ فیضی کو لکھے ایک خط میں اس مصلحت اندیشی کی مثال ملاحظہ کیجیے:

''عورتوں کے متعلق تمہاری رائے کہ وہ دنیوی اور معاشی علوم کو پڑھیں اور تم اس کو پسند نہیں کرتیں کہ عورتیں خود کمائیں اور کھائیں۔لیکن یاد رکھو کہ مردوں نے جتنے ظلم عورتوں پر کیے ہیں اس بل پر کیے کہ عورتیں ان کی دست نگر تھیں۔تم عورتوں کا بہادر اور دیو پیکر ہونا اچھا نہیں سمجھتی ہو۔لیکن یہ تو پرانا خیال تھا کہ عورتوں کو دھان پان، چھوئی موئی اور روئی کا گالا ہونا چاہیے۔جمال اور حسن نزاکت پر موقوف نہیں تنومندی، دلیری، دیو پیکری اور شجاعت میں بھی حسن وجمال قائم رہ سکتا ہے۔مرد نما عورتیں زنانہ نزاکت سے زیادہ محبوب ہوسکتی ہیں۔'' ۲۹۰

شبلی نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ قوم اور صرف قوم کے لیے اپنا سب کچھ قربان کرنا چاہتے ہیں۔وہ کہیں بھی فرشتہ نہیں بنے بلکہ انسان نظر آتے ہیں۔خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہیں

اور جمال پسند اور حسن پرست شخصیت کے مالک نظر آتے ہیں۔ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہشوں سے جکڑا ہوا ہے۔لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔'' (خطوط شبلی۔ص۔۵۳)

دراصل یہ ان کے مزاج کی شوخی اور ان کی طبیعت کا نمونہ ہے۔ساتھ ہی عالم، ادیب، فلسفی اور مورخ کے اندر چھپے انسان کی روح کا پرتو بھی ہے۔یہی انسانی روح جو بجلی کی طرح تڑپ اٹھتی ہے۔اس تڑپ کے لیے ان کے خطوط کی زبان اور ان کے والہانہ اندازِ بیان پر ہیجانی کیفیت کا اطلاق کیا گیا ہے۔شبلی جب عطیہ فیضی کی بیماری کا حال سنتے ہیں تو ''تار'' سے خیریت دریافت کرتے ہیں اور اکثر خطوط میں پوجا کرنے کی باتیں بھی کردیتے ہیں۔ایک خط میں عطیہ فیضی کو لکھتے ہیں:

''قرۃ عینی!

تمہارا خط جو مدت کے بعد ملا تو بے ساختہ میں نے آنکھوں سے لگالیا اور دیر تک بار بار پڑھتا رہا، افسوس دیر تک ملنے کی امید نہیں۔ میں وطن احباب، آرام سب چھوڑ سکتا ہوں لیکن ایک مذہبی، اور قومی کام کیونکر چھوڑ دوں۔'' (خطوط شبلی۔ص۔۳۹)

مولانا شبلی نے موسیقی کی باقاعدہ تحصیل وتکمیل تو نہ کی تھی، پھر وہ اس فن سے اس حد تک واقف تھے کہ صحیح وسقیم کی تمیز بہ آسانی کر لیتے تھے۔ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں نے تم سے ایک دفعہ خواجہ حافظ کے شعر سنے تم کو خدا نے خوش آواز عطا کی ہے اور نہایت موثر آواز ہے لیکن افسوس ہوا تم کو ہندوستانی موسیقی سے واقفیت نہیں۔اس لیے تم بالکل بے سُرا گا رہی تھیں۔موسیقی کی معمولی معلومات ضرور ہیں ورنہ بے لطفی پیدا ہوتی ہے۔بارہا تم سے گانا سننے کو جی چاہا لیکن رک گیا کہ تمہاری کنگری اور تانیں بے قاعدہ تھیں۔بمبئی میں اس فن کو لوگ مطلق نہیں جانتے یہاں تک کہ جن کا یہ پیشہ ہے وہ بھی محض جاہل ہیں۔'' (خطوط شبلی۔ص۔۴۸)

شبلی کے خط میں ان کے سفر کے حالات بھی درج ہیں۔شبلی نے قسطنطنیہ اور دوسرے مقامات کے سفر کیے، وہ اپنے سفر کی داستان اپنے مکتوب الیہم کو ارسال کرتے رہتے تھے۔انھوں نے نینی تال کے سفر کا جو منظر پیش کیا ہے وہ ان کے اسلوب میں محاکات نگاری اور متحرک تصویر کشی کا بہت اچھا نمونہ کہا جاسکتا ہے۔قسطنطنیہ کا حال ایک خط میں اس طرح بیان کرتے ہیں:

''آج جمعہ کا دن تھا اور معمول کے موافق مرکب سلطانی کا نظارہ گاہ تھا۔میں بھی ہمہ تن شوق بن کر گیا۔جامع حمیدیہ میں داخل ہوگیا۔سلطان المعظم بڑی شان وشوکت سے آئے جب سلطان تشریف لاتے ہیں تو اطلسی پردے چھوڑ دیے جاتے ہیں اور کوئی شخص ان کو دیکھ نہیں سکتا۔'' (خط بنام شیخ حبیب اللہ۔۱۹ جون ۱۸۹۴)

''خطوطِ شبلی'' میں ان کی شخصیت کا جمالیاتی پہلو زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور یہاں وہ صرف ایک مولوی نہیں بلکہ زندہ دل اور زندہ جاوید انسان نظر آتے ہیں۔دوسری طرف ''مکاتیب شبلی'' کے خطوط جو انھوں نے اپنے احباب اور دیگر ہم عصروں کو لکھے ہیں ان میں ان کی شخصیت کے مختلف پہلو سامنے آتے ہیں جو ان کے شخصی رویے، رجحان، ذہنی میلان اور فکر ونظر کو سمجھنے میں زیادہ معاون ہیں۔

خطوط کے مطالعہ سے دلچسپ اور خیال انگیز بات سامنے آتی ہے کہ سرسید کے نامور رفقاء میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جسے آپس میں ایک دوسرے سے اختلاف نہ ہو اور اس کے ساتھ یہ سب سرسید سے بھی کسی نہ کسی پہلو اختلاف رکھتے تھے۔اس کے باوجود بھی مدرسۃ العلوم کی تحریک سے الگ نہ ہوتے تھے۔شبلی کے خطوط پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''خطوں کی زمین اتنی مانوس اور شاداب ہوتی ہے کہ سارا خط ایک قطعہ چمن معلوم ہوتا ہے۔مخاطب کے ذوقی تقاضے بھی اتنے مدنظر رہتے ہیں کہ خط میں مکتوب الیہ کے لیے تلخی بھی ہو تو بھی لطف سے خالی نہیں ہوتا۔'' (وجہی سے عبدالحق تک۔ص۔۲۹۹)

✿✿✿

ڈاکٹر حنا آفرین

غالبؔ اور نئی غزل کی روایت

ہر عہد میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس عہد سے آگے کی باتیں کرتے ہیں،، غالبؔ بھی انھی لوگوں میں سے ایک تھے جو اپنے عہد کے علاوہ آئندہ زمانے کی باتیں کرتے تھے۔ ان کی اسی خصوصیت کی بنا پر انھیں مستقبل کا شاعر کہا گیا۔ یہ انسانی نفسیات ہے کہ انسان کو کوئی بات تبھی معنی خیز لگتی ہے جب وہ بات، اس کی ضرورتوں کو پورا کرتی ہو، اس کی زندگی کے مسائل سے بحث کرتی ہو اور جس میں اس کے اپنے عہد کی جھلکیاں نظر آتی ہوں۔ مثلاً کسی شاعر کا شعر تبھی پسند آتا ہے جب وہ شعر اس کے کسی جذبے، احساس یا خیال کی ترجمانی کرتا ہو۔ غالبؔ کی مقبولیت کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے اشعار میں ان موضوعات کو نادر انداز میں باندھا ہے جو ہر زمانے کے انسان کی نمائندگی کرتے ہیں۔

غالبؔ نے جب غزل گوئی شروع کی اس وقت شعرا غزل میں گل و بلبل اور حسن و عشق تک ہی محدود تھے۔ چونکہ غالبؔ ایک ذہین طبیعت کے مالک تھے اور روایتی اور فرسودہ روش پر چلنا ان کی فطرت کے خلاف تھا۔ لہٰذا انھوں نے الگ راستہ اختیار کیا۔ غالبؔ نے غزل کے دامن کو وسیع کیا اسے صرف حسن وَ عشق کے موضوعات تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں نئے موضوعات شامل کیے۔ زندگی سے مُتعلق فلسفہ پیش کیا، حیات و کائنات کی باتیں کیں، دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ کیا وغیرہ۔ مثال دیکھیے:

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود   پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

غالب کے ان اشعار میں استفہامیہ انداز ہے۔ اپنی مضطرب طبع کے باعث سوال قائم کرتے ہیں کہ یہ نقش کس کی شوخیِ تحریر کا ہے۔ وہ محض بے چین دل کے ساتھ سوال ہی قائم نہیں کرتے ہیں بلکہ زندگی کی حقیقت بھی بیان کرتے ہیں۔ انسان جس حیات و کائنات کے پیچھے بھاگ رہا ہے اس کی حقیقت لمحاتی ہے۔ یہ حیات و کائنات کا فلسفہ ہر دور میں قائم و دائم ہے۔ جب تک دنیا موجود ہے تب تک لوگ، اِس کے اسرار و رُموز پر سوچتے رہیں گے:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا !
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا!

جینے کا مزا تبھی تک ہے جب تک انسان پر یہ حقیقت آشکار ہے کہ موت ایک نہ ایک دن ضرور آنی ہے۔ اگر موت نہ آتی تو زندگی جینے کا مزا نہیں آتا اور وہ اس کے لیے تگ و دو ہی نہ کرتا۔ کسی چیز کی اہمیت تب ہی ہے جب اس کے ضائع ہونے کا خوف ہو۔ غرض موت کو انسانی حرکت و عمل کا محرک قرار دیا ہے۔ غالب یہیں پر خاموش نہیں ہوئے بلکہ اس دنیا کی خواہش نے انھیں اتنا آگے بڑھا دیا ہے کہ وہ اس زندگی میں ہی سب کچھ حاصل کر لینا چاہتے ہیں:

ہے کہاں، تمنا کا دوسرا قدم یارب!
ہم نے دشتِ امکاں کو، ایک نقشِ پا ،پایا

یہاں شاعر کی خواہشیں اس قدر وسیع اور عزائم اتنے بلند ہیں کہ امکان کی وسعتوں کی حیثیت ایک قدم سے زیادہ نہیں۔ امکان کے ساتھ لفظ دشت کی ترکیب سے غالب نے دراصل امکانات کی وسعت کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ پھر یہ بات کہی ہے کہ دشت کا پھیلاؤ اپنی جگہ لیکن میری تمناؤں کے سامنے اس کی حیثیت ایک قدم سے زیادہ نہیں۔

غالب کی طبع میں جو اضطراب تھا، چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھنے کی جو خواہش تھی وہ ان کے اشعار میں نظر آتی ہے وہی بے چینی وہی اضطراب جو ہمیں جدید شعرا میں نظر آتا ہے۔ غالب نے اس کی روایت بہت پہلے ڈال دی تھی۔

غالبؔ ان حقائق کا بھی ذکر کرتے ہیں جو نظروں سے پوشیدہ ہیں مگر امکان کے محرکات ان کو وجود میں لاتے ہیں:

قفس میں مجھ سے رُودادِ چمن کہتے ، نہ ڈر ہمدم!
گری ہے جس پہ کل بجلی ،وہ میرا آشیاں کیوں ہو!

اس شعر میں غالبؔ نے بجلی کو بربادی کی وجہ بتانے پر ہی اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس کے بعد کے امکانات بھی ظاہر کیے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ جس آشیانے پر بجلی گری ہے اس کا ہی آشیانہ ہو۔ غالبؔ اس طرح کے امکانات پیش کر کے حال کی صورتحال کو گوارا بنا رہے ہیں اور زندگی جینے کا حوصلہ بخش رہے ہیں۔ ان کی یہ بات دل میں امید کی کرن جگا رہی ہے۔ غالبؔ ناامیدی میں بھی امید کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ دکھ اور تکلیف میں بھی پریشان نہیں ہوتے، پست ہمت اور نہ ہی بے حوصلہ نظر آتے ہیں۔ یاس و ناامیدی میں بھی ان کی نظر پستی کی طرف نہ رہ کر بلندی کی طرف رہتی ہے اور امید کی مشعل جلائے رکھتے ہیں:

گو ہاتھ کو جنبش نہیں ،آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

ساغر و مینا کا استعمال تبھی ہوگا جب ہاتھوں میں حرکت و عمل کی طاقت ہوگی۔ جنبش نہ ہونے کے باوجود بھی ان کی امید ختم نہیں ہوتی، وہ ہاتھوں سے نہ سہی آنکھوں سے ہی پینے میں سرشاری محسوس کرتے ہیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے آج کا انسان ہے جو اپنے دل میں بہت سی آرزوئیں اور تمنائیں رکھتا ہے اور ان سب کو حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ مشکل و پریشانی میں بھی اس کے حوصلے پست نہیں ہوتے بلکہ تھوڑی دیر آرام کے بعد پھر سے نئی قوت کے ساتھ چیزوں کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔

اپنی مضطرب طبیعت کے باعث ہی غالبؔ جنت میں دوزخ کو ملانے کی بات کرتے ہیں۔ ایسا کہنے کے لیے ایک بڑے حوصلے اور شوخی کی ضرورت تھی جو اس دور کے شاعروں میں غالبؔ کے

علاوہ کسی کے یہاں نہیں ملتی۔

کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملا لیں ،یارب!
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی

چیزوں کو مختلف انداز میں دیکھنے کی آرزو غالبؔ کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہے۔کوئی بھی ذہین آدمی چیزوں کو اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کی روشنی میں دیکھنا چاہتا ہے۔غالبؔ کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جنت اور دوزخ دونوں کو الگ الگ دیکھنے کے بجائے اس میں امتزاج پیدا کرکے پھر برتنے کی خواہش کا اظہار کیا ہے جو اسے اپنے دور کے شاعروں سے منفرد بناتا ہے۔دوسری بات یہ کہ سیر کرنے کی بات کہہ کر دراصل غالبؔ نے اپنے اُس شعر کی فکری تصدیق کی ہے جس میں جنت کے تعلق سے دل کے بہلانے کا مضمون باندھا ہے لیکن پیش نظر شعر میں 'تھوڑی سی فضا اور سہی' کے فقرے سے شوخی کی فضا قائم ہوگئی ہے۔

انیسویں صدی میں جب سائنس نے اتنی زیادہ ایجادات نہیں کی تھیں اور مادی طور پر بھی ملک کی اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی اس کے باوجود غالبؔ کا ذہن اپنے زمانے سے آگے کی باتیں سوچتا تھا جس کا احساس انھیں خود بھی تھا:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج
میں عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں

غالبؔ لوگوں کو ناکامی میں بھی کامیابی کی راہ دکھاتے ہیں۔یہی حوصلہ ان کے مضطرب ذہن کو اس طرح کے شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے۔وہ اس راز سے واقف ہیں کہ حرکت وعمل،تغیر اور ان کے نتیجے،مسرت وغم کی چھاؤں فطرت کا قانون ہے۔ہماری بھلائی اسی میں ہے کہ حالات کو سازگار کرنے کی کوشش کریں اور جو بھی خوشی میسر آتی ہے اس سے زندگی کو خوبصورت بنائیں:

رات دن گردش میں ہیں، سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ، گھبرائیں کیا

۲

غالبؔ نے اپنے اشعار کے ذریعے لوگوں کو جدید فکر اور نیا ذہن دیا جس سے نئی غزل کی روایت پڑی۔ غالبؔ زندگی کی ناکامیوں اور ناخوشگواریوں کے باوجود غم واندوہ کی حالت میں بھی زندہ رہنے کا حوصلہ بخشتے نظر آتے ہیں۔ وہ افسردگی اور حرماں نصیبی کا ذکر تو کرتے ہیں مگر ایسے عزم وحوصلے کے ساتھ کہ انسان پھر سے جی اٹھتا ہے:

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

غمِ ہستی کا، اسدؔ! کس سے ہو جز مرگ، علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے، آدمی غم سے نجات پائے کیوں!

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ تمام اشیا، جذبے اور کیفیت پر فتح حاصل کرنا چاہتا ہے۔ غالبؔ نے بھی یہی کیا، انھوں نے مشکلوں اور پریشانیوں پر فتح حاصل کر کے اسے خود کے لیے آسان بنالیا۔ دل ودماغ کو حوصلہ بخشنے کے لیے شمع کی مثال پیش کی ہے۔ صرف یہیں تک ہی اپنے ذہن کو محدود نہیں رکھا بلکہ غم اور موت کو لازم وملزوم قرار دیا کہ موت سے پہلے انسان غم سے نجات حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ کائنات ایسی جگہ ہے جہاں انسان کو مختلف طرح کی مشکلوں کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔ کبھی کبھی وہ خود کو اس دنیا میں تنہا بھی محسوس کرتا ہے اور ایسی چیز یا جگہ کی تلاش کرتا ہے جو اسے تسکین اور آسودگی عطا کر سکے۔ ایسے انتشار اور اضمحلال کے دور میں وہ غالبؔ کے اشعار پڑھ کر تسکین محسوس کرتا ہے۔ اس طرح غالبؔ کا غم صرف ان کا ہی غم نہ رہ کر آفاقی بن جاتا ہے۔ غالبؔ ذہنی تناؤ میں بھی انسان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ سکھاتے ہیں اور اس سے آنکھیں ملانے کا حوصلہ بخشتے ہیں۔

موجودہ عہد بہت پریشانیوں اور کلفتوں بھرا ہے۔ اس دور میں ہر شخص حرکت وعمل میں لگا ہوا

ہے اور دوسرے پر سبقت حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ اس کا دل و ذہن ہر وقت مضطرب رہتا ہے۔ آرزوؤں اور خواہشوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ایسے میں اسے کہیں کامیابی اور کہیں ناکامی حاصل ہوتی ہے۔ وہ کامیابی پر تو خوش ہوتا ہے مگر جب اس کے حصے میں ناکامی آتی ہے تو افسردہ ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی وقت میں وہ غالبؔ کے اشعار پڑھ کر خود کو پھر سے توانا اور عزم سے بھرپور محسوس کرتا ہے اور زندگی کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرتا ہے۔ غالبؔ نے نامساعد حالات میں بھی تسکین وسکون کا پہلو تلاش کر کے جدید فکر کو تقویت بخشی اور نئے انداز میں غزل کہنے کی ابتدا کی۔ غالبؔ محبوب کی ناگوار لگنے والی باتوں سے بھی دل برداشتہ نہیں ہوتے اس میں بھی آسودگی تلاش کر لیتے ہیں اور اس سے محظوظ ہونے کی کیفیت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس درد میں درد کے ساتھ مسکراہٹ ہے، چین وسکون کے ساتھ بے چینی اور اضطراب بھی ہے۔ وہ محبوب سے وفا کرتے ہیں مگر وفا کرنے کے بعد بھی محبوب ان کا نہیں ہوتا اور ہرجائی پن سے باز نہیں آتا تو اس کی یاد میں آہ وبکاہ نہیں کرتے بلکہ پھر دوسرا ہی جذبہ غالب آجاتا ہے:

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
وفا کیسی، کہاں کا عشق، جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر اے سنگ دل، تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو!

غالبؔ دل گرفتہ ہو کر خاموش نہیں بیٹھتے بلکہ نئے حوصلے اور عزم کے ساتھ زندگی جینے کا ہنر سکھاتے ہیں۔ وہ عشق کے معاملے میں بھی ماتم کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ محرومی یہاں بھی ان کا راستہ نہیں روکتی۔ اگر سر پھوڑنا ہی عاشق کی قسمت میں لکھا ہے تو وہ کہیں بھی سر پھوڑ سکتا ہے اِس کے لیے اسے محبوب کے آستانے کی ضرورت نہیں ہے۔

غالبؔ محبوب کی نظرِ التفات کے لیے صرف خوشامد پر ہی قناعت نہیں کرتے۔ بے التفاتی کی صورت میں زبردستی کرنے میں بھی دریغ نہیں کرتے۔ اس طرح انھوں نے روایتی عاشق کے

کردار میں تبدیلی پیدا کی۔ ان کا یہ انفراد اردو شاعری کو ایک عطیہ ہے۔ مثلاً

ہم سے کُھل جاؤ بہ وقتِ مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

عجز و نیاز سے تو نہ آیا وہ راہ پر
دامن کو اُس کے آج حریفانہ کھینچیے

غالبؔ کی یہی انفرادیت پسندی انھیں اپنے زمانے کے شعرا سے الگ کرتی ہے۔ غالبؔ محبوب کے عشق میں جان سے گزرنے کے عمل کو دماغ کا خلل قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ ماننا ہے کہ عشق تو موت سے لڑنے کا حوصلہ بخشتا ہے۔ زندگی سے ہار جانا بزدلی کی علامت ہے۔ اس کیفیت کا شعر دیکھیے:

بلبل کے کاروبار پہ، ہیں خندہ ہائے گل
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا

غالبؔ کے دور میں کسی بھی شاعر نے عشق کو دماغ کا خلل قرار نہیں دیا لیکن ایسا مضمون باندھ کر غالبؔ نے غزل میں جدید فکر کا آغاز کیا۔ آج کے برق رفتار دور میں جب سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ انسان بہتر سے بہتر کی تلاش میں سرگرداں ہے تو ایسے وقت میں عشق کو دماغ کا خلل ہی قرار دیا جا سکتا ہے۔

دنیاوی مظاہر سے اتنی دلچسپی غالبؔ کی فکر کو جدید دور کی فکر سے ہم آہنگ کر دیتی ہے جہاں مادی اشیا کو فریب سمجھ کر اصل حسن کو تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی بلکہ مادی اشیا سے لطف و انبساط حاصل کرنے کا رجحان ملتا ہے۔ ہر چیز میں غالبؔ منفی پہلو کے بجائے مثبت پہلو تلاش کرتے ہیں جو انھیں کلاسیکی شعرا سے الگ کرتا ہے۔ مثال دیکھیے:

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا رُوئے آب پر کائی

صد جلوہ رُوبرو ہے، جو مژگاں اٹھائیے
طاقت کہاں کہ دید کا احسان اٹھائیے

کائی وہیں جمتی ہے جہاں پانی رُکا ہوا اور گندا ہو لیکن شاعر نے اس میں منفی پہلو کے بجائے مثبت پہلو یہ تلاش کیا ہے کہ سبزہ کو اگنے کے لیے جب کہیں جگہ نہیں ملی تو پانی کے اوپر ہریالی بن کر چھا گیا۔ اسی طرح سے غالبؔ نے دوسرے شعر میں کہا کہ نشاط حاصل کرنے کے سینکڑوں جلوے ہیں۔ یہ انسان پر منحصر ہے کہ وہ مظاہر فطرت کو غور سے دیکھے اور اس سے لطف حاصل کرے۔

غالبؔ نے اپنی غزلوں کے ذریعے مشکل پسندی اور تخیل پرواز کی بنیاد ڈالی۔ مشکل پسندی کے باعث انھیں نظر انداز بھی کیا گیا مگر اسی مشکل پسندی اور تخیل پرواز نے انھیں ہردلعزیز بنا دیا اور جدید دور میں اسے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ غالبؔ جس طرح وسائل کے ذریعے نتیجے تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ کوئی بھی حقیقت خاموشی سے تسلیم نہیں کرتے ہیں، ویسا آج کے جدید دور میں ہو رہا ہے۔ غالبؔ نے اس کی نشاندہی اپنے اشعار کے ذریعے بہت پہلے کر دی تھی۔ آج کا دور سائنس اور ٹکنالوجی کا دور ہے جس میں عقلیت پر زور دیا جاتا ہے۔ چیزوں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے۔ آج کا انسان دل برداشتہ ہو کر مایوسی اور خواہش مرگ میں مبتلا نہیں ہے بلکہ اپنی فکر اور تخیل کے ذریعے مسئلوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنی ہی رو میں چلتا جا رہا ہے۔ غالبؔ بھی اپنے اشعار میں یہی کرتے نظر آتے ہیں اور حقائق سے بلند تصور رکھتے ہیں جو انھیں نئی روایت سے جوڑ دیتا ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر، کہاں دیکھیے، تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے، نہ پا ہے رکاب میں

غالبؔ اس شعر میں ترقی کی جانب بڑھتے ہوئے نظر آ رہے ہیں بالکل نئی نسل کی مانند جو جدید اشیا کی تلاش میں سرگرداں ہے اور جو موجودہ اشیا پر انحصار نہ کر کے تخلیقِ نو میں لگی ہوئی ہے۔ اس طرح غالبؔ بھی حال سے رشتہ قائم کرتے ہوئے مستقبل سے مربوط نظر آتے ہیں۔

ہر انسان کو مشکل کام مشکل نظر آتا ہے مگر غالبؔ کی طبع چونکہ دشوار پسند تھی اس لیے انھیں دشوار کام بھی [illegible] لگتا ہے۔ [illegible] رہنے کا رجحان جدید دور میں بہت نمایاں ہے جسے غالبؔ نے اپنے

اشعار کے ذریعے انیسویں صدی میں ہی عام کر دیا تھا:

تھی نو آموز فنا، ہمت ِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ، یہ کام بھی آساں نکلا

غالؔب ایک حقیقت پسندانہ شعور رکھتے تھے اس لیے وہ کائنات اور انسانی وجود کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ انسان کی ہستی کو مختلف طریقوں سے جانچتے اور پرکھتے نظر آتے ہیں۔ ان کی شاعری میں ہر دور کے انسان کو اپنا عکس نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ شاعری ہر دور میں اپنی اہمیت قائم کرالیتی ہے اور دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے۔ غالؔب محض اپنی خوبیوں اور طاقتوں کا ہی ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا بھی ذکر کرتے ہیں۔ انسانی زندگی کے چھوٹے بڑے ہر جذبے سے سروکار رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ زندگی کے مختلف موقعوں پر غالؔب کے اشعار یاد آجاتے ہیں جو انھیں اپنے عہد سے ہمارے زمانے میں پہنچا دیتے ہیں ۔غالؔب کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے آفتاب احمد لکھتے ہیں:

> 'مجھے غالؔب کی دنیا انسانوں کی دنیا نظر آتی ہے۔ اس میں امید و بیم بھی ہے اور شکر و شکایت بھی۔ 'مرغ اسیر' کی سی کوشش بھی اور 'حسرتِ تعمیر' بھی۔ یہاں بہار کے پھول بھی کھلتے ہیں اور خزاں کے پھول بھی۔ درد و غم کی کسک بھی ہے اور زندگی سے لطف و انبساط اُٹھانے کی خواہش بھی۔ حسنِ طبیعت اور ذوقِ جمال بھی ہے اور حسِ مزاح و ظرافت بھی۔ مختصر یہ کہ غالؔب کی دنیا ہماری آپ کی جانی پہچانی دنیا ہے۔ اس کی فضا میں آدمی آسودگی کے ساتھ اور کھل کے سانس لے سکتا ہے۔'
>
> (بحوالہ 'غالؔب کی تخلیقی حسیت' از شمیم حنفی ص ۲۲۰)

غالؔب کی شاعری میں ہر عمر اور ہر دور کے افراد کو اپنے خیالات، جذبات اور احساسات غرض تمام کیفیات کا عکس نظر آجاتا ہے۔ انھوں نے جس طرح سے استعاراتی انداز میں اشعار کو باندھا

ہے اس سے اس میں ایک طرح کا ابہام پیدا ہو جاتا ہے۔ استعارے اور ابہام مل کر ایسی فضا تخلیق کرتے ہیں جس کے نتیجے میں اشعار ایک سے زیادہ معنی کے حامل ہو جاتے ہیں اور ان کا مفہوم وسیع ہو جاتا ہے۔ وہ ہر زمانے کی ضرورتوں سے اپنا رشتہ استوار کر لیتے ہیں۔ غالبؔ کی شاعری کی دنیا ہمارے آس پاس کی دنیا سے مماثل قرار پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر دور کا انسان اس سے مانوس اور قریب ہوتا چلا جاتا ہے۔

غالبؔ نے اپنی شاعری میں ایسے مسائل بیان کیے ہیں جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔ انھوں نے ٹھوس حقائق پر سوالات قائم کیے ہیں۔ کچھ کا حل خود تلاش کیا اور کچھ کا حل قاری پر چھوڑ دیا۔ غالبؔ کا دل اسی طرح سے مضطرب نظر آتا ہے جیسا آج کے دور کے انسان کا دل بے چینی اور انتشار سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی شاعری کا مرکز انسان کی ہستی ہے۔ جس طرح سے آج کا فرد منفرد نظر آنا چاہتا ہے اسی طرح غالبؔ بھی منفرد نظر آنا چاہتے ہیں اور اس کا انھیں احساس بھی تھا۔ غالبؔ انسانی زندگی کی مسرتوں اور کلفتوں کا بیان اپنی شاعری میں صداقت کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ محض عشق کی کیفیات ہی بیان نہیں کرتے، زندگی اور کائنات کا فلسفہ بھی پیش کرتے ہیں۔ مایوسی اور ناامیدی میں بھی اُمید کی کرن جگائے رکھتے ہیں۔ زندگی کو کس طرح سے خوشگوار بنایا جا سکتا ہے اس کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں۔ الغرض نئی غزل کی روایت کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے ہم غالبؔ کی شاعری میں بہت کچھ دریافت کر سکتے ہیں۔ جو موضوعات و مسائل نئی غزل کی پہچان ہیں، ان کی بنیادیں وہاں موجود ہیں اور اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ نئی غزل کی روایت کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم غالبؔ کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔

✿✿✿

ڈاکٹر واحد نظیر

عہدِ حاضر میں غالبؔ کی معنویت

غالبؔ ایک بڑے فنکار ہیں اور بڑے فنکار کے اثرات جغرافیائی اور زمانی حدود سے بالاتر ہوتے ہیں۔ ان کے فن کا حصہ صرف آس پاس کی زندگی نہیں بلکہ وہ سارے مسائل و موضوعات بنتے ہیں، جن کی حیثیت آفاقی ہوتی ہے۔ جو سرحدوں کے تابع نہیں، کائناتی سچائی کے مظہر ہوتے ہیں۔ سچائی کے اظہار، فکر و جذبہ کے خصائص اور زبان و بیان کے تجربے میں اتنی وسعت ہوتی ہے کہ آئندہ زمانوں سے ان کا رشتہ استوار ہوتا رہتا ہے۔ دائرے یہاں بھی ابھرتے ہیں لیکن وہ تخلیقی فن پاروں کے نہیں، قاری کی ترجیحات کا عکس ہوتے ہیں جنھیں ریت پر بنے جامد دائروں سے تعبیر نہیں کر سکتے کہ توسیع کی صورت میں اپنا وجود ہی کھو بیٹھیں۔ ان کی حیثیت سمندر کی سطح پر بنتے، پھیلتے، گم ہوتے اور پھر مرکز بدل کر ابھرتے ہوئے دائروں کی ہوتی ہے، جو جس جگہ کنکر مارے اس کے دائرے کا مرکز وہیں سر ابھارتا ہے۔ غالبؔ نے شاعری سے یہی کام لیا ہے۔ ہر لفظ، غور و فکر کے جداگانہ دائرے بناتا ہے اور ہر قاری اپنے شعور کے مطابق تعبیر کا مرکز متعین کرتا ہے۔ یہاں لفظ گنجینۂ معنی بن کر جامد نہیں ہوتا بلکہ گنجینۂ معنی کے طلسم کا کردار ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالبؔ کے شعروں میں الفاظ جس تناسب میں فکر کی ترجمانی کرتے ہیں، اس سے زیادہ اُن فکری عناصر کا مدفن ہوتے ہیں، جن کے لیے اظہار کے پیرائے کافی نہیں اور تنگنائے غزل کا ظرف بیان کی وسعت کے سامنے معذور نظر آتے ہیں۔ جو فکر خلعتِ اظہار کی زیبائی سے سرفراز ہوتی ہے وہ محض اجمال ہے۔ تفصیل اس سکوت میں پوشیدہ ہے جس کے بیان میں دشتِ امکاں کی وسعت ایک نقش پا سے زیادہ نہیں۔ معنی آفرینی اور نکتہ سنجی کی اسی خو نے جہاں غالبؔ کو تفصیل سے زیادہ اشارے مرتب کرنے پر آمادہ کیا وہیں اس شعری روایت سے منحرف بھی کیا جس کی اساس لفظ و صورت کے آہنگ اور سکہ بند موضوعات پر تھی۔

حیات و کائنات کے اسرار کی شرح و تعبیر مشرقی شعریات کی امتیازی شناخت ہے۔ غالب نے بھی اس روایت کو آگے بڑھایا لیکن اتباعِ محض کے طور پر نہیں بلکہ اپنے حصے کی ذہانت اور ندرتِ تفکر کی شمولیت کے ساتھ۔ ان کی فکر ذہن سے زیادہ وجدان پر مرکوز رہی۔ ان کے سامنے یہ سوال ہمیشہ اضطراب اور کشمکش کا نشان بنا رہا کہ ظاہر کی ٹوٹ پھوٹ کا اثر جوہر پہ ہے یا جوہر کے اضطراب سے ظاہر ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو رہا ہے؟ اس سوال کے جواب کی تلاش نے انھیں انسانی اور کائناتی حقیقت کے ایسے نادیدہ جہانوں کی سیر کرائی، جن کے دیدہ ہونے کی خوش گمانی عام تھی۔ ان تک رسائی کے لیے نئے اندازِ فکر اور انھیں اظہار کی سطح پر لانے کے لیے نئے تلازمے درکار تھے۔ اس طرح غالب کی شاعری بہ یک وقت نہ صرف موضوع، فکر اور زبان تینوں سطحوں پر نئی ہونے کا جواز فراہم کر رہی تھی بلکہ ایک ایسی مہتم بالشان تخلیقی روایت کی بنیاد گزار بھی بن رہی تھی جو آئندہ نسلوں کے روحانی مسائل کی تفہیم کے تمام تر نہیں تو بیشتر تقاضوں پر کھری اُتر سکے۔

موجودہ عہد میں غالب کی معنویت کے انسلاکات پر غور کریں تو یہی تین پہلو یعنی موضوع، فکر اور زبان اہم ہیں۔ ظاہر ہے موضوع کی معنویت تب ہی آشکار ہو سکتی ہے جب آج کی غزل کے اہم موضوعات کے نقوش غالب کی غزل میں روشن ہوں۔ ذات کی شکست و ریخت کے نتیجے میں کم ہوتی ہوئی انفرادیت اور اقدارِ آدم کی پامالی کے نتیجے میں دم توڑتی انسانیت وہ بڑے محور ہیں جن کا نئی غزل کے موضوعات طواف کرتے ہیں۔ کائنات کی بھیڑ میں اپنی ذات کی بازیافت کی خو نے آج کے فن کار کو جو حوصلہ عطا کیا وہ یقیناً غالب کا تربیت یافتہ ہے۔ ظفر عدیم نے اپنے مضمون 'نئی غزل کے تجربے' میں لکھا ہے:

> ''قلعہ معلی کے اطراف میں غزل کی ملاقات فکر کے سالک اور فن کے مجذوب غالب سے ہوئی تو غزل کے قالب میں نئی روح جاگ اٹھی، از سرِ نو تجسیم و تلبیس کی اس کی دیرینہ تمنا پوری ہوئی اور اب جب وہ شہر عالم میں انتخاب کے افق ادب پر نمودار ہوئی تو وہ بالکل نئی غزل تھی، جدید، تر و تازہ۔۔۔غالب نے کوئی تجربہ نہیں کیا غزل کو ماضی کے چاہِ بابل سے نکال کر آنے والے تمام ادوار و ایام کے اجالوں کے لیے وہ ماہِ نخشب بنا دیا جس کی روشنی چند فرسنگ تک نہیں، اردو شاعری کی قیامت تک پھیلی رہے گی اور اس کا نیا پن کبھی ماند نہیں پڑے گا۔''
>
> (فکر و تحقیق، سہ ماہی، نئی غزل نمبر، جنوری۔ مارچ ۲۰۱۳ء، ص ۲۶۰)

اس حوالے سے غالب ہمیں دو صورتوں میں متوجہ کرتے ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ ایسے موضوعات غالب کے فکر وفن کا حوالہ بنے جن کی حیثیت آفاقی ہے۔ دوسری صورت اس نہج کے موضوعات کی ہے جنھیں غالب استعاراتی انداز میں پیش کرتے ہیں۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقائق کے بیان میں لفظ قطعیت کے نہیں بلکہ استعارے کی شکل اختیار کر جاتے ہیں اور تعبیریں زمانی تحدید کے امکانات سے محفوظ ہو جاتی ہیں۔ یہی تخلیقی رویہ ہے جو غالب کے شعروں کو ہشت پہل بناتا ہے اور ہر قاری اپنے مطلب کی چیز برآمد کر لیتا ہے:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے | ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

ممکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں | میں دشتِ غم میں آہوئے صیاد دیدہ ہوں

بس ہجومِ ناامیدی خاک میں مل جائے گی | یہ جو اک لذت ہماری سعیِ بے حاصل میں ہے

ان اشعار پر غور کریں تو صرف وہ صورتِ حال مذکور نہیں ہے جو عہد غالب میں موجود تھی اور جس سے غالب روز و شب جوجھ رہے تھے۔ غالب نے دنیا کو صرف بازیچہ نہیں بلکہ بازیچۂ اطفال کہہ کر کئی اشارے پرو دیے ہیں۔ اطفال کی رعایت سے بازیچہ پھر تماشا صرف لفظی مناسبات کی حیثیت نہیں رکھتے۔ یہاں علامتِ تصغیر سے دنیا کی تحقیر بھی مقصود ہے اور لفظ اطفال سے تماشا کے غیر سنجیدہ ہونے کی تصدیق بھی۔ اب اس شعر کے ایک ایک لفظ پر غور کرتے رہیے اور اپنی ترجیحات یا صورتِ حال کے مطابق معبر کرتے جائیے جہاں بھی اور جس دور میں بھی ایسا عمل سرزد ہوتا جو عقل وشعور کے منافی ہو یہ شعر اپنی تعبیر فراہم کر لے گا۔ وہ غالب کے دور کا معاشرہ ہو یا آج کا پارلیامنٹ یا پھر آئندہ زمانوں میں چاند پر آباد ہونے والی ممکنہ بستی کے مکینوں میں حصے بخرے کا تنازعہ۔

دوسرے شعر میں 'آہوئے صیاد دیدہ' کے خوف ودہشت کے نتیجے میں بھول کر بھی آرمیدہ نہ ہونے کی بات دراصل غالب نے مصائب سے نجات کے لیے کوشش پیہم کی بات کی ہے۔ اب اس کی تعبیر کسی خاص صورتِ حال کی پابند نہیں۔ یہاں آہو مغلوب ہوتی ہوئی تہذیب اور صیاد غالب ہونے والی تہذیب ہوسکتی ہے۔ کمزور انسان آہو اور طاقتور انسان صیاد ہوسکتا ہے۔ گویا جب بھی کوئی فرد، طبقہ اور سماج کسی ایسی صورتِ حال کا شکار ہوگا جو اس کی بربادی کا سبب بن جائے، یہ شعر اپنی معنویت تلاش کرے گا۔ آج گلوبلائزیشن کے عہد میں جس طرح عالمی صنعت کار، مقامی صنعت کاروں پہ غالب

ہیں اس تناظر میں بھی یہ شعرِ متائی صنعت کاروں کے خوف کی بھی ترجمانی کرسکتا ہے۔

تیسرے شعر میں غالبؔ کے عزم و حوصلے کی داد دینی پڑتی ہے جہاں ہجومِ ناامیدی کی مسرت کے لیے کوئی امکان باقی نہیں۔ایسا حوصلہ جو سعیِ بے حاصل میں بھی لذت محسوس کرتا ہے۔موجودہ عہد میں صرف ایک منظر پر غور کیجیے کہ ایک عہدے کے لیے سینکڑوں امیدوار تگ و دو کرتے ہیں۔ جانتے ہوئے بھی کہ اس کے لیے پہلے سے ہی کسی کا نام طے ہے اور ہماری حیثیت زیبِ داستاں سے زیادہ نہیں۔پھر بھی کوشش میں کوئی کسر باقی نہیں رہتی۔دراصل یہ اس لذت کی بات ہے جو کوشش اور نتیجے کے درمیان ہماری آنکھوں میں خواب بھرتی ہے اور زندگی کی دوڑ میں ہمیں توانا رکھتی ہے۔قربت محبوب سے شرفیابی کی لذت اور ہے اور حصول قربت میں ناکامی کی لذت اور۔

غالبؔ کی شاعری میں فکری سطح پر ایک انقلاب آفریں رویے کی کارفرمائی ہے۔ایک ایسا رویہ جو مولانا روم سے میرؔ تک صدیوں پر محیط شعری روایت کا تربیت یافتہ ضرور ہے لیکن اس تربیت کی نوعیت انحراف کی ہے، انجذاب کی نہیں۔یا یوں کہیں کہ خوبصورت عمارتوں کو دیکھ کر اس کی نقالی نہیں بلکہ جداگانہ عمارت اس طور پر بنانے کا عمل ہے جس کا نقشہ مختلف ہو اور جس کے سارے نقش ونگار اپنے ہوں۔اس انفرادیت پسندانہ رویے نے غالبؔ کی شاعری کو ایسا کردار عطا کیا جو پہلو دار ہے، وہ نہ صرف فرشتہ ہے اور نا ہی شیطان۔وہ بشری خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔وہ نہ ہی علائق دنیا سے دست بردار ہو کر ذات حقیقی میں ضم ہو جانے والا رومی کا کردار ہے اور نہ ہی اشیا اور حقائق کی جمالیات کا شیدائی سعدیؔ کا کردار۔اس میں حافظؔ کے کردار کی صرف ایسی یک رنگی بھی نہیں جو صرف آسودگی اور لذت یابی کا خوگر ہے اور نہ ہی میرؔ کا صابر اور قانع کردار جسے ہر حال میں محبوب کی رضا پیاری ہے۔غالبؔ کا کردار منزل آشنا بھی ہے، گم کردۂ راہ بھی، مردِ آزاد بھی، رند شاہد باز بھی، ناز بردار بھی اور نازِ بے جا کا مخالف بھی۔جو نظر انداز ہونے پر منت و سماجت نہیں کرتا بلکہ اپنی خودداری کی آواز پر لبیک کہتا ہے۔وہ اکیسویں صدی کے انسان کی طرح حصول مقصد کے لیے مضطرب رہتا ہے اور آسانی سے مقصد حاصل ہو جائے تو اس کے اسباب پر غور وفکر کرتا ہے اور پھر مضطرب ہوتا ہے خواہ وہ محبوب کی التفات ہی کیوں نہ ہو:

تھی نو آموزِ وفا ہمت دشوار پسند سخت مشکل ہے کہ، یہ کام بھی آساں نکلا

صحبت میں غیر کی نہ پڑی ہو کہیں یہ خو	دینے لگا ہے بوسہ بغیر التجا کیے

غالب کا یہ رویہ دراصل چیزوں کو ان کے حقیقی تناظر میں دیکھنے اور پرکھنے کا نتیجہ ہے۔ موجودہ عہد کا بھی یہی ذہنی رویہ ہے کہ تحقیق وتصدیق کے بغیر ردوقبول کا مرحلہ نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق تک رسائی کے لیے ذہن ہمیشہ تلاش وجستجو میں مبتلا رہتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ علم کا منصب اور مقصد بھی یہی عرفان ہے۔ ہم تیرگی کو سینے سے لگا سکتے ہیں لیکن تیرگی ہی سمجھ کے، روشنی تسلیم کر کے نہیں۔ جوہر اصلی کے عرفان کی اس تڑپ نے غالب کے استفہامیہ انداز کو اتنا مستحکم کیا کہ وہ صرف مخلوق کو ہی سوالوں کے توسط سے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ خالق کی تفہیم میں بھی سراپا سوال بن جاتے ہیں:

غنچہ و گل کہاں سے آتے ہیں	ابر کیا چیز ہے، ہوا کیا ہے
جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

اصل واصول کی تفہیم کے مرحلے میں غالب کی تمناؤں کی انتہا نہیں رہتی وہ خدا اور خدائی کے کسی پہلو سے بھی نا آشنا نہیں رہنا چاہتے۔ وہ اس پر بھی قانع نہیں کہ عرش کی بلندی سے صرف دنیا کے تمام تر پہلوؤں کا عرفان ہو۔ ان کی تمنا تو عرش سے پرے مکیں ہوکر جملہ حقیقت کو دیکھنے کی ہے۔ اگرچہ یہ ممکن نہیں:

منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے	عرش سے پرے ہوتا، کاشکے مکاں اپنا

غالب کی فکر ایسی جہات اور نادیدہ جہانوں کی سیر میں سرگرداں تھی کہ نئی شعری لسانیات کی تشکیل کے بغیر ان کا اظہار ناممکن تھا۔ ان کی تہہ دار، عمیق اور پیچیدہ فکری روش ایک ایسی تخلیقی زبان کی متقاضی تھی جو لفظ کو علامت اور استعارے کی خوبی سے متصف کر سکے۔ غالب کی جدت پسند طبیعت نے اس محاذ پر بھی بت شکنی کا ثبوت دیا اور ایک ایسی پُرقوت تخلیقی زبان وجود میں آئی جس میں معنی در معنی اور فکر در فکر کے نباہ کی وہ صلاحیت موجود تھی جو اکیسویں صدی کے فکری کینوس کو بھی سمیٹنے میں ناکام نہیں ہوتی۔ اس روش نے غالب کو 'گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل' کی کشمکش اور 'گر نہیں ہے مرے اشعار میں معنی نہ سہی' کے جبر یہ اعتراف سے بھی دو چار کیا لیکن غالب اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ ان کے داخلی تخلیقی عمل کا سروکار صرف اس عہد اور کلاسیکیت کے دلدادہ ماحول سے نہیں بلکہ آئندہ زمانوں سے بھی ہے:

ہوں گرمیِ نشاطِ تصور سے نغمہ سنج	میں عندلیب گلشن نا آفریدہ ہوں

حامدی کاشمیری نے غالب کی اسی خوبی پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

'غالب ایک بڑے تخلیق کار ہیں، انھوں نے لسانیاتی عمل سے معجزہ کاری کی ہے۔ انھوں نے اپنے باطنی وجود سے پھوٹنے والے لاتعداد تجربات کی ایک نادرہ کار، ثروت منداور رنگارنگ کائنات خلق کی ہے۔ یہ کائنات انتہا نا آشنا اور زمانی و مکانی اعتبار سے لا محدود ہے۔ حقیقی کائنات کے برعکس ان کی شعری کائنات یکسانیت اور تکراریت سے مبرا ہے، یہ ہر پل بدلنے والے وقوعات کی تماشا گاہ ہے۔ یہی خودگر و خود آگاہ کائنات غالب کی بے پایاں تخلیقی قوتوں کا علامتی اظہار ہے، اور اس میں باریابی کے لیے شعری لسانیات کی کارگزاری سے بھرپور واقفیت لازمی ہے۔'

(حامدی کاشمیری: غالب جہان دیگر، مطبوعہ ۲۰۰۹ء، ص ۹۱)

حاصل کلام یہ ہے کہ غالب نے اپنے موضوع کی وسعت، فکر کی ندرت اور زبان کی تازگی سے متعلق جابجا اشارے کیے ہیں۔ ان اشاروں کا مخاطب بلا واسطہ طور پر ان کے ہم عصر اور اہل خطہ تھے لیکن بالواسطہ طور پر یہ اشارے آئندہ زمانوں اور پوری دنیا کے مکینوں سے اپنا رشتہ قائم کر رہے تھے۔ غیب سے مضامین کے آنے، لفظوں کو گنجینۂ معنی کے طلسم میں ڈھلنے، انداز بیاں اور کے متشکل ہونے اور ان بنیادوں پر گلشن نا آفریدہ کا عندلیب ہونے کے دعوے محض دعوے نہیں تھے بلکہ غالب ان سطحوں پر عملی نمونے پیش کر رہے تھے۔ اقدار شکنی، اخلاقی پامالی، تشدد پرستی، مادیت پرستی، بے چہرگی جیسے موضوعات جو موجودہ عہد کی شناخت ہیں فکری اور تخلیقی پیکر میں ڈھلنے کے طور طریقے غالب کی شاعری سے اخذ کرتے ہوئے محرومی کا شکار نہیں ہوتے۔ اسی طرح زبان کے لسانی رموز اور لفظ کی مخفی توانائی کی دریافت غالب کا وہ عمل ہے جس سے موجودہ تخلیقی زبان روشنی حاصل کر رہی ہے۔ اعادے کے طور پر میں یہ کہتے ہوئے اپنی بات مکمل کرنا چاہتا ہوں کہ موضوع، فکر اور زبان ہر سطح پر موجودہ عہد میں غالب کی معنویت کے پہلو نہ صرف روشن ہیں بلکہ کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو ازسرنو غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں۔

✿✿✿

احمد علی جوہر

غالب نامہ: غالب شناسی کا ایک معتبر حوالہ

مرزا غالب اردو زبان وادب کے ایک عظیم شاعر ہیں۔ عالمی ادبیات میں بھی ان کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ مرزا غالب نے جب اردو شاعری شروع کی تو ان پر مشکل پسندی کا الزام عائد کیا گیا۔ غالب نے اپنے معترضین پر خفگی کا اظہار یوں کیا۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل ہوتے ہیں ملول اس کو سن کے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل
نہ صلے کی تمنا نہ ستائش کی پرواہ گر مرے اشعار میں معنی نہ سہی

غالب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی زندگی میں ان کی شاعری کی شایانِ شان پذیرائی نہیں ہوئی، مگر غالبؔ اپنے اشعار کی خوبیوں سے واقف تھے اور وہ اس کے پہلے بڑے قدردان تھے۔ اس لئے انھوں نے یہ پیشین گوئی کی تھی۔

شہرتِ شعرم بگیتی بعدِ من خواہد شُدن

غالبؔ کی وفات کے بعد ان کی یہ پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ ان کی شاعری کی شہرت روز بروز بڑھتی گئی اور وہ ایک مشہور ومعروف شاعر کے روپ میں سامنے آئے۔ آج بھی غالبؔ عظیم اور محبوب شاعر ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صدیوں بعد بھی وہ مقبول رہیں گے۔ اس کی بڑی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ غالبؔ نے اپنی شاعری میں عام انسانی آرزوؤں، امنگوں اور خواہشوں کی ایسی مرقع کشی کی ہے اور اپنی شعری کائنات میں ایسا آئینہ خانہ سجایا ہے جس میں ہر عہد، ہر سماج اور ہر خطہ کے اہل دل کو اپنی تصویر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری میں ایسی کشش ہے کہ جو بھی اس کی طرف جھانکتا ہے، وہ اس پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ ان کی شاعری عام انسانی جذبات واحساسات کے بے حد قریب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا مطالعہ کرتے ہوئے غالبؔ ہی کی زبان میں کہنا پڑتا ہے۔

''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے''

غالبؔ کی شاعری انسانی ذہن ودل کو بے حد متاثر کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج صرف اُردو ہی میں نہیں بلکہ ہندی، انگریزی، فرانسیسی، ترکی، فارسی اور دیگر ہندوستانی علاقائی زبانوں میں غالبؔ مطالعہ کی توانا روایت نظر آتی ہے۔ اُردو میں غالبؔ شناسی کی ایک لمبی روایت ہے۔ اس کا باضابطہ آغاز ۱۸۹۷ء میں حالیؔ کی ''یادگارِ غالبؔ'' سے ہوا اور تاہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے۔ غالبؔ شناسی کی اس طویل روایت میں چند کتابیں ایسی ہیں جو آج بھی معتبر حوالہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ شیخ محمد اکرام کی کتاب ''غالبؔ نامہ'' کا شمار ایسی ہی کتابوں میں ہوتا ہے۔

یہ کتاب صرف مرزا غالبؔ کے سوانح حیات کا خلاصہ اور ان کی تصانیف پر تبصرہ نہیں ہے، بلکہ اس میں مسلسل کوشش کی گئی ہے کہ مرزا کی شخصی خصوصیات، ان کا مافی الضمیر، ان کے ذہنی ارتقا کی نشوونما، ان کی اُفتادِ طبع اور ان کے اخلاق وعادات کی تصویر نگاہوں کے سامنے آجائے اور ان کے کلام کی منفرد خصوصیات کو اُجاگر کیا جائے۔

مرزا غالبؔ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جتنا تنوع ان کی شاعری میں ہے، اسی طرح ان کی شخصیت میں تنوع ہے۔ غالبؔ کی شخصیت کی تشکیل اتنے موافق ومتضاد عناصر سے مل کر ہوئی ہے اور ان کی شخصیت میں اتنے رنگ ہیں کہ صرف ایک دریچہ سے اس کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ غالبؔ کی رنگارنگ شخصیت کو دیکھنے کے لئے ان کے کلام کے ساتھ ساتھ، ان کے عہد، ماحول، ان کے احباب وتلامذہ، ان کے معاصر موافقین ومخالفین کی تحریروں اور خود غالبؔ کے مختلف بیانات پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ تبھی ہم پورے غالبؔ کو دیکھ سکتے ہیں۔ شیخ اکرام اس فریضہ سے بڑی خوبی سے عہدہ برآ ہوئے ہیں۔ انھوں نے غالبؔ کی زندگی اور ان کے کلام پر ان کی تحریروں اور جلوۂ خضر، آبِ حیات، یادگارِ غالبؔ اور دوسری معتبر تحریروں کے حوالے سے بھرپور روشنی ڈالی ہے۔

شیخ اکرام کی یہ کتاب دو حصّوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصّے کا عنوان ''حیاتِ غالب'' ہے۔ اس میں غالبؔ کی زندگی، اس کے نشیب وفراز اور ان کی زندگی سے وابستہ اہم واقعات وحالات کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ کتاب کے اس حصّے کی ترتیب میں شیخ اکرام نے سب سے زیادہ مدد غالبؔ کے

ان فارسی خطوط سے لی ہے جو ''پنج آہنگ'' میں ہیں۔ان خطوط کے متعلق شیخ اکرام لکھتے ہیں:

> ''یہ خطوط غالب کے سوانح نگار کے لیے ایک بیش بہا خزانہ ہیں۔اور کسی کتاب سے مرزا کی ان ستائیس سالوں کی کوششوں، مصیبتوں اور ان کے ماحول کا صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا جتنا ان خطوط کے مطالعہ سے۔ہم نے 'غالب نامہ' میں دوسرے تذکروں سے زیادہ مفصل اور صحیح حالات لکھنے کی کوشش کی ہے۔اور اگر ہم اس کوشش میں کامیاب ہوئے ہیں تو یہ بیشتر اسی محنت کا صلہ ہے جو ہم نے ان خطوط کے مطالعہ میں صرف کی ہے۔''(۱)

کتاب کا یہ حصہ تحقیقی نقطۂ نظر سے بڑااہم ہے۔اب تک مرزا کے سوانح کو بیان کرنے میں یا تو عقیدت سے کام لیا گیا تھا یا اس کی خامیاں ہی خامیاں گنائی گئی تھیں۔اس کے برعکس یہاں مرزا کے سوانح کے اچھے، بُرے دونوں پہلوؤں پر تحقیقی حوالوں سے روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔کتاب کا دوسرا حصہ ''غالب نما'' کے عنوان سے ہے۔اس میں مرزا کی ادبی زندگی کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔شیخ اکرام نے مرزا غالب کی ادبی زندگی کو پانچ ادوار میں تقسیم کیا ہے۔دورِ اوّل ۱۷۹۷ء۔۱۸۲۱ء۔دورِ دوم ۱۸۲۱ء۔۱۸۲۷ء۔دورِ سوم ۱۸۲۷ء۔۱۸۴۷ء۔دورِ چہارم ۱۸۴۷ء۔۱۸۵۷ء۔دورِ پنجم ۱۸۵۷ء۔۱۸۶۹ء۔ (۲)

مرزا کے ابتدائی دور کے کلام میں شیخ اکرام نے فارسی الفاظ وتراکیب کی کثرت، زبان کی ثقالت، مضامین وخیالات کی غرابت، شاعرانہ حسن کے فقدان، آمد کی کمی، آورد اور تصنع کی شکایت کی ہے۔(۳) اور مثال میں درج ذیل اشعار کو پیش کیا ہے۔

پاؤں میں جب وہ حنا باندھتے ہیں میرے ہاتھوں کو جدا باندھتے ہیں

شاید کہ مرگیا ترا رُخسار دیکھ کر پیمانہ رات ماہ کا لبریزِ نُور تھا (۴)

یہاں شیخ اکرام نے ''غالب کی تشبیہیں اور استعارے'' کے عنوان کے تحت اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ غالب کے اس دور کے کلام میں تشبیہوں کی افراط تھی۔یہ تشبیہیں نئی ضرور تھیں مگر ان میں غرابت تھی۔شیخ اکرام نے یہاں اس حقیقت سے بھی پردہ اُٹھایا ہے کہ دہلی آمد

کے بعد غالبؔ کے کلام میں بڑی تیزی سے تبدیلی رُونما ہورہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی دور میں بھی ان کے یہاں کئی خوبصورت غزلیں ملتی ہیں۔

حُسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

درد سے میرے ہے تجھکو بیقراری ہائے ہائے　　کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے

مرزا غالبؔ کے دوسرے دَور کی شاعری کی نسبت شیخ اکرام لکھتے ہیں:

''دوسرے دور میں آئینہ طبیعت کا رنگ صاف ہوگیا ہے۔ فارسی ترکیبیں کم ہیں۔ اور خیالات بھی صاف اور خوشگوار ہیں۔ کلام میں بیدلؔ اور صائبؔ کے بجائے عرفیؔ اور نظیریؔ کا رنگ غالب ہے۔ تشبیہیں نیچرل اور موزوں ہیں۔ مضامین خیالی کے بجائے حالی ہیں۔ اور اظہارِ خیالات میں خلوص نمایاں ہے۔ مضامین کے نقطۂ نظر سے اس دور کی اہم ترین خصوصیت نفسیات انسانی کے متعلق شاعر کی معلومات ہیں۔''(۵)

اس دور کا رنگِ شاعری ملاحظہ ہو۔

مُدّت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے　　جوشِ قدح سے بزمِ چراغاں کئے ہوئے

ہاں وہ نہیں خدا پرست جاؤ وہ بے وفا سہی　　جس کو ہو دین و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس دور میں مرزا غالبؔ نے اپنے بہت سے اشعار میں الفاظ وتراکیب میں ترمیم کی۔ اس حک واضافہ سے ان کے کئی اشعار بے حد دلچسپ ہو گئے۔ مثلاً:

بُوئے گُل، نالۂ دل، دُودِ چراغ محفل　　جو تری بزم سے نکلا سو پریشان نکلا

اس کا پہلا مصرعہ یوں تھا۔ ''عشرت ایجاد چہ بُوئے گُل و گو دودِ چراغ''

مرزا کے تیسرے دور کو شیخ اکرام نے عام طور پر فارسی شاعری کا دور بتایا ہے۔ اور لکھا ہے۔

''قیام کلکتہ کے زمانے میں اور اس کے بعد ایک عرصے تک مرزا نے فارسی اشعار زیادہ لکھے۔ اور اُردو اشعار کم۔ اس لئے ۱۸۲۷ء یا اس سے کچھ عرصہ بعد

سے لے کر ۱۸۴۷ء تک مرزا کی اصل ادبی زبان فارسی سمجھی جاتی ہے۔‘‘(۶)

چوتھے دور کو شیخ اکرام نے درباری شاعری کا دور بتایا ہے۔ اس دور میں مرزا نے چند قصائد اور زیادہ تر غزلیں کہیں۔ غزلوں کی زبان سادہ اور آسان ہے اور تشبیہیں اور فارسی ترکیبیں کم ہیں۔ اس دور میں غالبؔ کے یہاں کئی ایسی غزلیں ملتی ہیں جو ان کے عام معیارِ شاعری پر پوری نہیں اترتیں۔

واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی

آمد بہار کی ہے جو بُلبل ہے نغمہ سنج اڑتی سی اک خبر ہے زبانی طیُور کی

اس دور میں مرزا کے یہاں صرف عام سی غزلیں نہیں ملتیں، بلکہ بہت اچھی غزلیں بھی نظر آتی ہیں۔

سب کہاں کچھ لالہ وگل میں نمایاں ہوگئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہوگئیں

دل ہی تو ہے نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

اس دور کی شاعری کی امتیازی صفت زبان کی سلاست اور خیالات کی سادگی کے علاوہ شوخی اور ظرافت ہے۔

حُسن میں حُور سے بڑھکر نہیں ہونے کے کبھی آپ کا شیوہ وانداز و ادا اور سہی

مرزا غالبؔ کی ادبی زندگی کا پانچواں دور شیخ اکرام کے مطابق غدر کے بعد کا دور ہے۔ اس دور میں مرزا نے اُردو کی بہ نسبت فارسی اشعار زیادہ کہے ہیں۔ شیخ اکرام نے مرزا کے پانچویں دور کی ’’بہترین یادگاران کے اردو خطوط‘‘ کو بتایا ہے۔

یہاں شیخ اکرام نے غالبؔ کی ادبی زندگی کو مختلف ادوار میں تقسیم کر کے، ان مختلف دوروں کی ادبی خصوصیات پر جس تنقیدی انداز سے روشنی ڈالی ہے، اس سے ان کے معروضی انداز اور تجزیاتی ذہن کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کی بھر پور جھلک موازنہ میں بھی نظر آتی ہے۔ ’’غالب اور مشاہیر اُردو شعرا کا موازنہ‘‘ کے عنوان کے تحت شیخ اکرام نے غالبؔ کا موازنہ خسروؔ، فیضیؔ اور اقبالؔ سے کیا ہے۔ عام طور پر موازنہ میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ دو شاعروں کے درمیان سطحی مشابہتوں پر نظر ڈال کر موازنہ کر دیا جاتا ہے۔ شیخ اکرام کے یہاں یہ رویہ نظر نہیں آتا۔ وہ دو شاعروں کے درمیان

موازنہ کرتے ہوئے پہلے شاعر کے عہد، ماحول اور ادبی روایات کا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر فکر و خیال، زبان و بیان اور اسلوب کی سطح پر دونوں شاعروں کے درمیان افتراق و مماثلت کے پہلوؤں کو تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح سے وہ موازنہ کا ایک خوبصورت معیار قائم کرتے ہیں۔ دیکھئے درج ذیل اقتباس میں شیخ اکرام نے غالبؔ کا موازنہ خسروؔ سے کیا ہے۔

> ''غالبؔ اور خسروؔ کے طرز الگ الگ تھے۔ خسروؔ سادہ اور پُر اثر اشعار پسند کرتے تھے۔ اور مرزا اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مشکل گوئی کا رواج ہو گیا تھا.......
> خسروؔ نے کئی بلند پایہ مثنویاں لکھی ہیں۔ اور مثنوی نگاری میں ان کا مرتبہ غالبؔ سے بلند ہے۔ لیکن قصیدہ نویسی میں شاید مرزا امیر خسروؔ سے آگے نکل گئے ہیں۔ خسروؔ کے کئی قصیدے با اثر ہیں۔ اور طرح طرح کی صنعتوں سے مرصّع ہیں، لیکن ان میں وہ رفعتِ تخیل اور حکیمانہ خیالات نہیں جو مرزا کے قصائد میں ہیں۔''(۷)

کتاب کے اس حصے میں شیخ اکرام نے 'غالبؔ کے اُردو خطوط' کا فکری و فنی جائزہ لیتے ہوئے اردو نثر میں اس کے مقام و مرتبہ کے تعین کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ 'عام تبصرہ' کے ذیلی عنوانات 'غالبؔ کی مقبولیت کے اسباب'، 'اعتراضات'، 'نیچرل شاعری'، 'غالبؔ کی عشقیہ شاعری'، 'غالبؔ کا فلسفہ'، 'مرزا غالبؔ کا مذہب'، 'غالبؔ اور وطنیت'، 'مغلیہ تہذیب و تمدّن کا ترجمان' اور مرزا غالبؔ کی شخصیت' کے تحت انھوں نے بڑی معنی خیز گفتگو کی ہے اور اپنی تنقیدی مہارت کا ثبوت پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں عموماً جو تنقیدی رویّہ نظر آتا ہے، اسے نفسیاتی تنقید سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ان کے یہاں مشرقی اور مغربی اندازِ نقد بھی پایا جاتا ہے۔ کہیں کہیں تاثراتی تنقید کے نقوش بھی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ذیل کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ''شاہجہاں کا تاج محل اور غالبؔ کی شاعری، فن کی دو مختلف اصناف کے شاہکار ہیں۔ لیکن دونوں کی تہہ میں ایک ہی رُوح کارفرما ہے۔ تخیل کی سربلندی ولطافت، تلاشِ حسن اور فنی پختگی دونوں میں معراج کمالِ پر ہے۔''(۸)

شیخ اکرام کی تنقید عیوب سے پاک نہیں کہی جا سکتی لیکن اس کے باوجود ان کا غیر جانبدارانہ

نقطۂ نظر، ان کا محتاط رویہ اور متوازن انداز ان کی تنقید کو معیار و وقار عطا کرتا ہے اور انہیں ایک اہم ناقد کی شکل میں سامنے لاتا ہے۔ شیخ اکرام کی اس کتاب میں بیک وقت کئی فن جمع ہو گئے ہیں۔ اس میں فن سوانح بھی ہے اور تحقیق وتنقید، تجزیہ وتبصرہ بھی۔ اس کتاب میں شیخ محمد اکرام مرزا غالبؔ کے سوانح نگار، محقق اور ناقد کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ غالبؔ مطالعہ میں اس کتاب کی اس اعتبار سے بڑی اہمیت ہے کہ پہلی بار اس کتاب نے بے جا مدح وتنقیص سے گُریز کرتے ہوئے منطقی واستدلالی بنیادوں پر غالبؔ کے افہام وتفہیم کی راہ ہموار کی۔ اس کتاب کے بارے میں علی جواد زیدی کی رائے ہے۔

> ''حالیؔ کی یادگار (۱۸۹۷ء) کے بعد 'غالب نامہ' پہلی کتاب ہے جو حیاتِ غالب کو نئے بسط وشرح کے ساتھ موضوعِ گفتگو بناتی ہے۔ جہاں تک تنقید کا تعلق ہے، بجنوری کی عقیدت مندانہ افراط کے بعد یہ متوازن نقطۂ نظر اپنانے کی کوشش کرتی ہے...... تنقیدی سطح پر حالیؔ کے علاوہ عبدالرحمٰن بجنوری کی عقیدت کے جوش ووفورِ جذبات کا سامنا تھا...... اس کے برعکس مغربی معیاروں ہی کی ڈھال تیار کرکے عبداللطیف نے ایک غیر متوازن منفیانہ رجحان اپنا لیا تھا۔ اکرام نے ان دونوں کے مقابلے میں فکر غالب کی تفہیم وتشریح کے لیے کچھ نئے زاویے اپنائے..... ان کی تنقید ایک تہذیب یافتہ ذہن کی پروردہ ہے اور شاعر کے فکر وفن کو خارجی اور داخلی عوامل کے پس منظر میں پرکھتی ہے۔'' (۹)

گیان چند جین نے اس کتاب کو 'یادگارِ غالب' کے بعد غالب کے سوانح کی تحقیق اور ان کی تصانیف کی تنقید کے لئے بڑی اہم کتاب بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''انھوں نے غالبؔ کی شاعری پر عام تبصرہ کیا، جو کتاب کا سب سے اہم حصہ ہے..... غالبؔ اور وطنیت کی بحث میں اکرام کی متوازن رائے ہے کہ غالبؔ جدید مفہوم میں وطن پرست نہ تھے۔ آخری اہم چیز جس کی طرف انھوں نے توجہ دلائی غالبؔ اور مغلیہ ذہنیت کی ترجمانی ہے۔ اکرام کے نزدیک مغل

نفاست پسندی، خوش معاشی، عیش کوشی اور ہموار طبعی کے قائل ہوتے ہیں اور
غالبؔ ان اقدار کے بہترین ترجمان تھے۔ اسی طرح اکرام نے غالبؔ کی
شخصیت اور نفسیات کا وسیع پیمانے پر جائزہ لیا۔ بحیثیت مجموعی اکرام کے
جائزے سے ہر جگہ تشفی ہوتی ہے۔" (۱۰)

آج اگرچہ غالبؔ مطالعہ کی نئی نئی جہتیں سامنے آچکی ہیں اور نئے زاویوں سے کلامِ غالبؔ کے معنوی ابعاد کو اُجاگر کرنے کی سعی کی جارہی ہے، اس کے باوجود 'غالب نامہ' کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ غالبؔ اوران کے کلام سے متعلق بہت سے نکات و جہات کو سامنے لانے میں 'غالب نامہ' کو امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ آج بھی غالب شناسی میں یہ کتاب معتبر اساس کی حیثیت رکھتی ہے۔

حواشی :

(۱) شیخ محمد اکرام، غالب نامہ، ص،۹۲۔

(۲) ایضاً ص،۲۱۰۔

(۳) ایضاً ص،۲۱۱۔

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً ص،۲۱۹۔

(۶) ایضاً ص،۲۳۲۔

(۷) ایضاً ص،۴۵،۳۴۴۔

(۸) ایضاً ص،۱۷۔

(۹) علی جواد زیدی: شیخ محمد اکرام کا دائرۂ تحقیق، مشمولہ غالب نامہ ۱۹۸۹ء دہلی: غالب انسٹی ٹیوٹ، ص ۱۷ تا ۱۹۔

(۱۰) گیان چند جین: غالب کے نقاد، رموزِ غالب فروری ۱۹۶۷ء دہلی: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، ص۳۱۹،۳۲۰۔

✿✿✿

سید عینین علی حق

شرح دیوان مومنؔ

دبستان دہلی کے حوالے سے گفتگو شروع کی جاتی ہے تو شاعروں کا ایک جم غفیر نظر آتا ہے مگر اپنے وطن عزیز سے انتہا درجے کی محبت، قناعت پسندی، صبر تحمل اور تصوف و طریقت کا شائبہ چند ہی شعرائے کرام کے یہاں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ انہیں شعرا میں 18 ویں صدی کے اوائل یعنی 1800 میں دہلی کے کوچہ چیلان میں پیدا ہونے والے اور زینے سے گر 21 مئی 1851 میں دنیائے فانی کو الوداع کہنے والے مومن خاں مومنؔ سر فہرست ہیں۔ مومنؔ کی طبیعت میں خوشامد کے عناصر نہیں پائے جاتے کیوں مومن ایک صوفی مشرب شاعر تھے۔ مومن کو میری سمجھ سے ان معنوں میں محدود کیا گیا کہ وہ عاشق مزاج شاعر قرار دیے گئے۔ آج ان کے فن کے حوالے سے گفتگو کم مگر ان کی عشقیہ شاعری کے حوالے سے زیادہ گفتگو کی جاتی ہے۔ جب کہ مومن کا کمال یہ بھی کم نہیں کہ اردو زبان میں لازوال غزلیں انہوں نے پیش کیں۔ مومن کی شاعری میں جنسی لذت کا اظہار ملتا ہے مگر ان کے یہاں وہ توازن برقرار ہے جو دبستان لکھنؤ کے شعرا میں نہیں رہ سکا ۔وہ عملی زندگی کو ہی نہیں اپنی شاعری کو بھی عشق و عاشقی کے اردگرد پیش کرتے ہیں۔ ان کے جد عہد مغلیہ میں کشمیر سے آئے اور طبیب کی حیثیت سے دربار میں داخل ہوئے، حکومت سے پرگنہ نرنول کی جاگیریں بھی حاصل کیں مگر مومنؔ کے دادا حکیم نامدار خاں کی شرافت کا نواب فیض طلب خاں نے ناجائز فائدہ اٹھایا اور ساری جائدادیں ضبط کر لیں۔

درباروں سے وابستگی کے باوجود مومنؔ کے اباواجداد بزرگان دین کی تعلیمات سے اس قدر متاثر تھے کہ ان پر سلاطین کے اثرات مرتب نہیں ہوئے۔ مومن کے والد شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ سے

والہانہ عقیدت رکھتے تھے اور انہیں اپنی زندگی کے لیے مشعل راہ سمجھا کرتے تھے۔ محدث دہلویؒ نے ہی مومنؔ کی پیدائش پر ان کے کان میں صدائے اللہ اکبر پہنچائی اور ان کا نام مومن خاں تجویز کیا، مومن نے اپنے نام کو ہی تخلص کے طور پر اختیار کیا۔ پیدائش سے لے کر آخری سفر تک یہ قرب قائم رہا، مومن کی تدفین بھی محدث دہلوی کی درگاہ کے قریب ہوئی۔ قدرت نے مومن کو بلا کی ذہانت دی تھی، جس کی بنیاد پر انہوں نے عربی و فارسی، علم طب، علم نجوم، موسیقی اور مختلف قسم کے کھیلوں پر بھی ید طولیٰ حاصل کیا۔ اتنا ہی نہیں اردو شاعری کی بات کی جائے تو مومن نے تمام شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ مومن کی خاصیت یہ ہے کہ وہ اپنے فن میں انفرادیت رکھتے ہیں، کسی کی نقل کا تصور ان کے یہاں نہیں ملتا۔ حقیقت یہ ہے کہ اچھی شاعری خصوصاً اعلیٰ درجے کا غزل گو شاعر ہونے کے لیے تصوف کی تعلیمات کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے تبھی، غزل کے گیسو سنوارے جا سکتے ہیں۔ مومن کے یہاں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں، جس کی بنیاد پر انہوں نے اصناف شاعری میں قصیدہ، رباعی، واسوخت، غزل، ترکیب بند، مثنوی وغیرہ میں طبع آزمائی کی اور حق بھی ادا کیا۔ مومنؔ کا ایک دیوان اور چھ مثنویاں ہمارے درمیان موجود ہیں۔ دہلی سے محبت کا عالم یہ تھا کہ پانچ دفعہ الوداع کہنے کی کوشش کی مگر وطن عزیز سے دور نہیں رہ سکے۔ اسلاف کی تعلیم و تربیت نے انہیں خدا پرست اور متوکل بنا ڈالا تھا، امرا و سلاطین سے بے حد نفرت کرتے اور انہیں ہیچ سمجھتے تھے۔ ان کے دیگر ہم عصروں میں تو وظائف اور قصیدوں کے ذریعہ مال و منفعت حاصل کرنے کی چاہت موجود نظر آتی ہے مگر مومنؔ نے اپنے ہاتھوں کو دراز نہیں کیا اور نہ ہی کسی کے لیے قصیدوں کا نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ مومن اپنے موقف میں صاف تھے ان کے اندر ستائش اور صلے کی پرواہ نہیں تھی، ان کی بے نیازی نے انہیں شہرتِ دوام تک پہنچایا۔

دبستان دہلی کے شعرا میں یہ خصوصیات خواجہ میر دردؔ کے بعد انہی میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ جسے مومن کی انفرادیت اور خصوصیت قرار دینا ضروری ہے۔ اپنی اسی انفرادیت کے سبب مومن دوسرے شعرا پر فوقیت لے جاتے ہیں۔

مگر افسوس یہ ہے کہ مومن کے فن پر اس حد تک توجہ نہیں کی گئی جس طرز پر ان کے ہم عصروں غالب اور ذوق پر کی جاتی رہی ہے۔ اردو ادب کی موجودہ صورت یہ ہے کہ نئے باب کا در وانہیں کیا کرتے بلکہ وہی غالب اور ذوق توجہ کا مرکز رہا کرتے ہیں۔ مومن وہ شاعر ہیں، جن کے یہاں علوم کے جوار بھاٹے ٹھاٹیں مارتے ہیں۔ ان کی ایک انا یہ بھی تھی کہ وہ کسی کو اپنے مقابلے کا نہیں سمجھتے تھے جس کی وجہ سے سب کے غضب کا شکار رہے۔ اپنی شاعری میں بصیرت کا مظاہرہ نہیں کیا جس طریقے سے غالب اور ذوق نے کیا۔ غالب اور ذوق سے مومن کا معاملہ بالکل برعکس نظر آتا ہے۔ اور یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ ذوق اور غالب نے تمام عمر شاعری محض داد و تحسین اور انعام و اکرام کے لیے کی اور مومن نے اپنے ذوق وشوق کی خاطر۔ اگر توجہ کی ہوتی تو ان کی شاعری میں غلطیاں در نہیں آتیں۔ بقول حسرت موہانی

"جتنے اغلاط ان کے یہاں ہیں، کسی اور کے یہاں ہوتے تو اس کی زبان دانی اور استادی مشکوک ٹھہرتی، لیکن ان پر کوئی شک نہیں کرتا اور انہیں استاد تسلیم کرتا ہے۔"

دوسری سب سے اہم بات یہ ہے کہ اکثر ہم عصروں میں انا کی جنگ جاری رہتی ہے اور کوئی بھی ایک دوسرے کے فن کا اعتراف کرنے کو راضی نہیں ہوتا، مگر مرزا غالب جیسے ہم عصر بھی 21 مئی 1852 انتقال کے بعد ہی صحیح اپنے دوست مومن کے اعتراف میں کہتے:

"یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا۔ طبیعت اس کی معنی آفریں تھی۔"

مومن کی شاعری نے کل بھی متاثر کیا تھا اور آج بھی کر رہی ہے۔ مومن نے شاعری کے خداؤں سے بھی اپنا اعتراف کرایا تھا۔ مومن اپنی حیات میں ہی باکمال شاعروں کی فہرست میں شمار کیے جاتے تھے۔ مرزا غالب نے مومن کی عظمت کا اعتراف محض ان کا ایک شعر لے کر اس کے عوض پورے دیوان دینے کی بات کہی تھی۔

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

مومن کے ساتھ قدرت نے شروع سے تماشا کیا، ان کی تفہیم نہیں ہو سکی کیوں کہ مومن کو کوئی

ایسا شاگرد نہیں ملا جو مکمل طور پر انہیں دنیائے ادب میں پیش کرتا اور شرح و تعبیر کے ذریعہ ان کی شاعری کو وسعت دے کر مستحکم بناتا۔ اس معاملے میں غالب اور ذوق مقدر کے دھنی ہیں۔ غالب کو حالی اور ذوق کو محمد حسین آزاد جیسا شاگرد نصیب ہوا۔ ان دونوں شاگردوں کی صورت حال سے سبھی واقف ہیں۔ یہ اپنے اساتذہ کے علاوہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے، آزاد کو تو ذوق کے چیچک کے داغ بھی ستاروں کی مانند چمکتے نظر آتے ہیں۔ آزاد نے تو مومن کی تضحیک یہاں تک کر ڈالی کہ مومن کو آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں جگہ ہی نہیں دی اور بعد کی اشاعت میں شامل کیا جب کہ مومن آغاز میں ہی ذکر کے مستحق تھے۔ انتھک کوششوں کے باوجود بھی مومن کا قد کوتاہ نہیں ہوسکا اور غالب کے مدمقابل ہی کھڑے کیے جاتے رہے ہیں۔ آج ہمارے درمیان مومن جس بھی حد تک ہیں وہ اپنے ایک اکلوتے شاگرد شیفتہ کی کاوشوں کا ثمرہ ہیں ورنہ غالب، اقبال، ذوق کے دائرۂ کار سے کوئی نکلنا ہی نہیں چاہتا۔ یہاں میں نے دو غزل کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے۔

سچ تو یہ ہے بری بلا ہے عشق قہر ہے موت ہے قضا ہے عشق

محبت وہ شئے ہے جس کی چاشنی سبھی کو اچھی لگتی ہے۔ لیکن یہ تلخ حقیقت ہے کہ اس میں بربادی کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ غضب، ناانصافیوں اور زندگی کے خاتمے کے سوا کچھ نہیں ملتا، اس کے باوجود عشق کو عبادت جان کر ادائیگی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ دوسرے مصرعے میں عشق کے ساتھ بری بلا کا استعمال لاجواب ہے جس سے عشق کی عظمت میں اضافہ ہوتا نظر آتا ہے۔

وہ بہت پوچھتے ہیں کیا ہے عشق اثرِ غم ذرا بتا دینا

یہ معرکہ کا شعر ہے اور اس طرح کا شعر صرف مومن ہی کہہ سکتے ہیں مومن کی یہی خوبی انہیں دوسرے شاعروں سے منفرد کرتی ہے۔ مومن کہتے ہیں اثرِ غم ذرا بتا دینا۔ سوال ہے کہ غم کا اثر کس کو بتانے کی ضرورت ہے اور غم کا اثر ہوتا کیا ہے۔ عشق ایک ایسا افسانہ ہے جہاں مسرت کم اور درد زیادہ ہے۔ مومن حسن کی ان کیفیات سے بخوبی واقف ہیں لیکن اس خوبصورت شعر میں مزے کا پہلو یہ ہے کہ مومن چاہتے ہیں کہ اثرِ غم کی شناخت ہونے پر یہ سلسلہ عشق رواں رہے۔

آفت جاں ہے کوئی پردہ نشیں کہ مرے دل میں آ چھپا ہے عشق

قاعدے سے غور کریں تو مومن کے کئی اشعار روحانیت اور تصوف کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ کچھ شعر معنویت کے اعتبار سے عشق کے سرد وگرم موسم کی آمیزش کو پیش کرتے ہیں۔ عشق خاموشی سے دستک دیتا ہے، اتنی خاموشی سے کہ کبھی عاشق کو اس کا یقین بھی نہیں ہوتا کہ واقعی کوئی پردہ نشیں ہے یا محض مومن کے تخیل کی پرواز۔ مومن کی شاعرانہ کیفیات کا جواب نہیں۔

بوالہوس اور لاف جانبازی کھیل ہی کیا سمجھ لیا ہے عشق

مومن اس بات سے ناراض ہیں کہ عاشقوں نے محبت کی گہرائی کو سمجھا ہی نہیں۔ محبت ایک فنا ہو جانے والی کیفیت ہے اور اس کیفیت سے سرشاری کا جو رشتہ ہے وہی اس کا حصہ ہے۔ مومن اس بات سے نالاں ہیں کہ بدلتے ہوئے وقت میں محبت اور عشق کے مفہوم کھوتے جا رہے ہیں۔ بوالہوس کی تعداد زیادہ اور عشق کھیل بن گیا ہے۔ خودستائی کرنے والے اور طمع رکھنے والے دلیروں نے کیا عشق کو تماشا اور کھیل سمجھ لیا ہے۔

وصل میں احتمالِ شادیِ مرگ چارہ گر دردِ بے دوا ہے عشق

مومن کبھی کبھی غالب کی طرح الجھی ہوئی باتیں کرتے ہیں۔ اس شعر میں بھی یہ الجھاؤ برقرار ہے۔ عشق آشنا ہے جسے دشمن ہوتے ہیں اور دشمنوں سے اکثر بے وفائی کی امید ہی کی جاتی ہے۔ دشمن تکلیف ہی پہنچاتے ہیں اور عشق بھی تکلیف پہنچاتا ہے مگر دشمنوں کی تکلیف اس طرح اثر نہیں کرتی جیسی تکلیف عشق پر ہوتی ہے۔ مومن اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ عشق لاعلاج مرض ہے۔ وصل میسر نہ ہو تو پریشانی اور میسر ہو جائے تو موت کا احتمال ہوتا ہے۔ وصل کی کیفیات کو برداشت کرنا بھی ہر کے بس کی بات نہیں۔

سوجھے کیوں کر فریبِ دلداری دشمنِ آشنا نما ہے عشق

اس شعر کی کیفیت وہی ہے جو مندرہ بالا شعر کی ہے۔ بلکہ یہ شعر اس خیال کو وسعت دیتا نظر آتا ہے۔ اس میں مومن کہتے ہیں کہ دغا اور غداری کا تصور ممکن ہی نہیں کیوں کہ دشمن کوئی غیر تو نہیں

بلکہ اپنا ہے، جسے ہم نے خود سے زیادہ چاہا اور سمجھا ہے۔

کس ملاحت سرشت کو چاہا تلخ کامی پہ بامزا ہے عشق

یہ شعر بھی عجب کیفیت کا ہے۔ عشق کے مختلف مراحل ہیں۔ یہ مرحلہ پہلے سے کہیں زیادہ مشکل ہے کبھی محبوب کی کوئی بات پیاری لگتی ہے کبھی کسی بات پر گلہ نظر آتا ہے۔ چاہتوں کی ناکامی بھی مزہ دے جاتی ہے۔ لیکن محبوب کی ہر ادا مومن کو پیاری ہے۔

ہم کو ترجیح تم پہ ہے یعنی دل ربا حسن وجاں رہا ہے عشق

عشق وہ شے ہے جسے مومن دلبر اور معشوق سے تعبیر کر رہے ہیں۔ جس کے بغیر زندگی کا تصور ممکن نہیں اور عشق تمام ترجیحات میں ایک اہم توجہ کا مرکز ہے۔

دیکھ حالت مری کہیں کافر نام دوزخ کا کیوں دھرا ہے عشق

میری حالت عشق کے چکر میں غیر ہو چکی ہے، اور میرے پریشان کن حالات کو دیکھ کر کافر بھی یہ کہہ دیتے ہیں کہ بے وقوف تم نے دوزخ کا نام عشق رکھ دیا ہے۔

دیکھئے کس جگہ ڈبو دے گا میری کشتی کا ناخدا ہے عشق

مومن اس بات سے آگاہ ہیں کہ اکثر عشق میں ڈوبنے کی منزل آجاتی ہے۔ آگ کا دریا ہے ڈوب کے جانے کے مترادف۔ لیکن اس ڈوبنے کے احساس سے بھی زندگی کو ملال نہیں کیوں کہ سچا عاشق ان باتوں پر کان نہیں دھرتا۔

آپ مجھ سے نباہیں گے سچ ہے باوفا حسن و بے وفا ہے عشق

یہاں مومن اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں کہ حسن تو باوفا ہے۔ لیکن عشق بے وفا۔ کیوں کہ صدیوں سے عشق کی یہی کیفیت رہی ہے۔ وہ عشق کی اس کیفیت کو جانتے ہوئے بھی مطمئن ہیں۔ اس شعر میں مومن نے حسن و عشق کو ترازو کے الگ الگ پلڑوں پر رکھا ہے۔

میں وہ مجنون وحشت آرا ہوں نام سے میرے بھاگتا ہے عشق

یہ شعر بالکل منفرد کیفیت کا ہے۔ خود کو وحشت آرا مجنوں کہتے ہیں۔ اور میرا قد عشق سے بہت

اوپر پرواز کر چکا ہے عشق کے اثرات لاحق نہیں ہو سکتے بلکہ عشق تو میرے نام سے بھی بھاگتا ہے۔ جب کہ حقیقت اس کے ماسوا ہے۔ مومن عشق کا دوسرا نام ہے۔ اس طرح کی دلچسپ باتیں مومن کی اکثر و بیشتر غزلوں میں دیکھی جا سکتی ہیں۔

قیس و فرہاد و وامق و مومن   مر گئے سب ہی کیا دیا ہے عشق

مومن اس بات سے نالاں ہیں کہ عشق پر جان دینے کے باوجود کسی کو کچھ نہیں ملا۔ قیس و فرہاد اور وامق و مومن سب مر گئے۔ عشق کی راہ دشوار میں چاک گریبانی کے سوا کسی کو کچھ نہیں ملا۔ جو قیس و فرہاد کے ساتھ ہوا، وہی وامق اور مومن کے ساتھ بھی ہوا۔ مومن یہ کہہ رہے ہیں کہ میری سانسیں تو چل رہی ہیں مگر دراصل میں معطل ہو چکا ہوں۔ دراصل یہ اشعار عشق کے مختلف رنگوں کے افسانے کو بیان کرتے ہیں۔

2

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم   پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اس شعر کی خوبصورتی دو لفظوں میں پوشیدہ ہے اور مومن نے وہ دونوں الفاظ مصرعہ ثانی میں استعمال کیے ہیں۔ وہ الفاظ ہیں ''ناچار'' اور ''جی''۔ پہلا مصرعہ راہ عشق کی عمومی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اس شعر کے پہلے مصرعہ میں عاشقی کی کیفیت کا احاطہ کیا گیا ہے۔ عاشق، زندگی میں ہر قدم پر محبوب کے ہاتھوں سے فریب کھانے کے بعد یہ ٹھان لیتا ہے کہ اب زندگی میں آئندہ کسی سے نہیں ملے گا، ٹھان لینا بمعنی پکا ارادہ کر لینا، عزم عہد کر لینا۔ جب انسان کوئی بات دل میں ٹھان لیتا ہے تو پھر اپنے ارادے پر ثابت قدم رہنے کی گنجائش بڑھ جاتی ہے۔ چوٹ کی شدت کا اندازہ لفظ 'کسی' سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ عاشق اتنا مضطرب ہے کہ وہ کسی سے بھی آئندہ کوئی رسم و راہ رکھنے کو تیار دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن مصرعی ثانی میں وہی عزم وہی عہد پاش پاش ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور اس کا بنیادی سبب، دل کی ناچاری ہے۔ مومن نے دل کو 'جی' کے معنی میں استعمال کیا ہے، اور اس لفظ سے جان، سانس، زندگی طبیعت، محبت وغیرہ مفہوم مراد لیے ہیں۔ ناچار کے معنی عاجز، لاچار، مجبور، مفلس، محتاج وغیرہ ہیں۔ پہلے مصرعے میں کیفیت اپنی پوری شدت کے ساتھ ظاہر ہوتی

ہے۔ دوسرے مصرعے میں محض دل کی ناچاری کے سبب صورت حال کے بالکل تبدیل ہو جانے کا واضح اشارہ پیش کرتی ہے۔ ''پر کیا کریں'' کے ٹکڑے میں ایسی معصومیت پوشیدہ ہے جو حالات کی سنگینی اور مجبوری کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ ظاہر کر رہی ہے۔ اس غزل کا دوسرا شعر مطلع ثانی ہے:

ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم　　　منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بے کسی سے ہم

منہ دیکھ دیکھ رونا محاورہ ہے یعنی روتے ہوئے حیرانی یا حیرت سے دوسروں کا منہ تکنا، بے کسی کا مطلب ہے۔ اکیلا پن، بے مددگاری، عاجزی، لاچاری وغیرہ۔ درد و غم میں ڈوبے ہوئے عاشق کی بے تابیوں اور بے چینیوں کا بیان اس شعر میں مومن نے کیا ہے۔ عشق کی راہ میں چلتے ہوئے عاشق کی زندگی اتنی کرب انگیز ہوگئی ہے کہ زندگی کی ہنسی خوشی کا تصور ہی ملیامیٹ ہو چکا ہے۔ مسرت اور انبساط کی کیفیت قصہ پارینہ بن چکی ہے۔ عاشق کی زندگی میں ہر طرف اداسی اور محرومی ہے۔ ایسے میں عاشق کسی دوسرے کے چہرے پر ہنسی دیکھتا ہے تو اس کے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے۔ اور وہ حیرت سے لوگوں کا منہ تکنے لگتا ہے اور پھر اگلے پل آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب امڈ پڑتا ہے۔ ہنستے ہوئے چہروں کو دیکھ کر اس طرح پھوٹ کر رونا، اور خاص کر بے کسی کے عالم میں صورت حال کو مزید سنگین بنا دیتا ہے۔ اکیلے پن اور لاچاری کی یہ اذیت ہمارے دل میں عاشق کے تئیں ہمدردی کو جنم دیتی ہے۔

ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں بھلا　　　انصاف کیجئے پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم

اے محبوب ہم تیرے عاشقِ صادق ہیں اور تو ہم سے ہی بات چیت نہیں کرتا آخر تو ہی بتا تیرے اس رویہ کو ہم کیا نام دیں۔ تو ہی انصاف کر، ہم تجھ سے ہی جواب طلب کرتے ہیں کہ اس بے التفاتی کی کیا وجہ ہے جب کہ ہم نے تجھے چاہنے میں کوئی کمی نہیں کی ہے۔ پھر کیوں تو ہم سے کھنچا کھنچا رہتا ہے۔

بیزار جاں سے جو نہ ہوتے تو مانگتے　　　شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم

مومن اس شعر میں گلے شکوے کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ مجھ پر بیزاری کی حالت طاری ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم مدعی سے گواہ طلب کرتے۔ مومن کی تمام غزلیں عشق و عاشقی سے شرابور نظر آتی ہیں ان کا یہ مصرعہ بھی معشوق سے گفتگو ہے۔ بیزار کے مختلف معنی بھی برآمد ہو رہے

ہیں جس سے مختلف تناظر میں سوچا اور سمجھا بھی جا سکتا ہے۔

صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا لو بندگی، کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم

مومنؔ نے اس شعر میں رعایت لفظی کو بڑی فن کاری کے ساتھ برتا ہے۔ پہلے مصرعے میں صاحب کے معنی مالک اور اس کی رعایت سے غلام اور پھر غلام کے تعلق سے زندگی اور ''آزاد'' کے تعلق سے ''بندگی سے چھوٹ جانے کا'' صاحب، غلام اور زندگی اس شعر کے کلیدی الفاظ ہیں۔ غلام کے معنی 'بندے' کے ہوں گے۔ اس صورت میں شعر کا مفہوم سفر آخرت سے وابستہ دکھائی دیتا ہے۔ صاحب نے اس غلام کو آزاد کردیا یعنی مالک حقیقی نے بندے کو تمام طرح کی آزمائشوں سے نجات دے دی۔ گویا زندگی کا سفر ختم ہوگیا تو بندگی کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ یعنی حساب کتاب کے سارے دفتر بھی بند ہوگئے۔ ''صاحب'' یعنی محبوب نے اس غلام یعنی عاشق کو اگر اپنی بندگی سے آزاد کردیا، یعنی اپنے سارے رشتے منقطع کرلئے تو یہ قدم بھی عاشق کے لیے کسی افسوس کا باعث نہیں، بلکہ غلامی سے نجات حاصل کرنے اور آزادی کی فضا میں سانس لے کر وہ ذہنی طور پر خود بھی فرحت محسوس کرر ہا ہے۔ بندگی سے چھوٹنے پر وہ ایک طرح کی ذمہ داری سے نجات حاصل کرنے کا بیان کرر ہا ہے۔ 'لو بندگی' یعنی اپنی ذمہ داری وہ خوشی سے کسی اور کو سونپنے کے لیے راضی ہے اور اس عمل میں پچھتاوے کے بجائے اسے ذہنی سکون کی دولت میسر ہے۔

بے روئے مثل ابر نہ نکلا غبار دل کہتے تھے ان کو برق تبسم ہنسی سے ہم

مومن کا یہ مصرعہ شوخی سے شرابور نظر آتا ہے۔ اس میں رنج وملال کی باتیں ہو رہی ہیں اور کہا جا رہا ہے کہ غصے کا عالم یہ تھا کہ گھٹا اب تک باقی ہے اگر یہ رنج وملال ختم ہوجاتا تو ہم انہیں مزاق سے آسمانی ہنسی کہا کرتے تھے۔ یہاں مومن نے رونے کو ابر سے تشبیہ دی ہے۔

ان ناتوانیوں پہ بھی تھے خار راہ غیر کیوں کر نکالے جاتے نہ اس کی گلی سے ہم

مومن کے یہاں بہترین لفظیات کا استعمال بہت ہی خوب صورتی سے دیکھنے کو ملتا ہے، مومن نے اس مصرعے میں بھی وہ الفاظ پیش کیے ہیں جو نہایت ہی سلیس قرار دیے جا سکتے ہیں۔ مومن اردو کے ہی وہ الفاظ استعمال کرتے ہیں جو مکمل طور پر اردو میں مستعار لیے گیے ہیں۔ اس شعر میں

مومن نے حاسدین کو نشانہ بنایا ہے۔ شعر کا مفہوم یہی واضح کرتا ہے کہ ہمارا دیار معشوق سے نکالا جانا یقینی تھا چوں کہ ہم رقیب کی راہ کا روڑا بنے ہوئے تھے۔

کیا گل کھلے گا دیکھیے، ہے فصلِ گل تو دور اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

اس شعر میں شاعر نے صنعتِ تجنیس سے کام لیتا ہے(یعنی دو جگہ گل استعمال ہوا ہے جو تلفظ میں یکساں ہیں، لیکن معنی میں مختلف ہیں) کہتے ہیں ابھی بہار کا موسم دور ہے لیکن ہمیں سودا ہونے لگا ہے یعنی ہم پر ابھی سے دیوانگی طاری ہو چلی ہے۔ اس دیوانگی میں ہم کپڑے پھاڑ کر جنگل کا رخ کرتے ہیں، بہار آنے سے قبل ہماری یہ کیفیت ہے تو بہار آنے کے بعد ہمارا کیا انجام ہوگا یعنی بہار کے موسم میں ہماری حالت کے اور زیادہ خراب ہونے کا امکان ہے۔

منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھے بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم

اس میں شاعر کہتا ہے کہ وہ میری شکل دیکھنے سے قبل بھی کب ساتھ تھے جو ہم بے وجہ رنج وملال کریں وہ بھی آئینہ سے۔

ہے چھیڑا اختلاط بھی غیروں کے سامنے ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم

پیار محبت اخوت بھائی چارگی کا پیغام صرف اپنوں کے درمیان ہی نہیں بلکہ غیر کے سامنے پیش کیا مگر ہنس تو سکتا نہیں رونا پڑ سکتا ہے۔

وحشت ہے عشق پردہ نشیں میں دم بکا منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشم پری سے ہم

کیا دل کو لے گیا کوئی بے گانہ آشنا ہیں کچھ اجنبی سے ہم

متضاد الفاظ نے شعر میں اپنا جادو جگایا ہے اور شعر کی معنویت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ پہلے مصرعے میں بیگانہ کے ساتھ ہی آشنا کا ذکر ہے۔ 'بیگانہ آشنا' کی یہ ترکیب متاثر کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتی، کیونکہ یہ ترکیب انوکھی بھی ہے اور اس میں معنی کی متعدد جہتیں بھی شامل ہیں اور پھر ایسی ترکیب کی مناسبت سے مصرعہ ثانی میں اپنے کے ساتھ اجنبی کا ذکر ہے۔ شعر کا مفہوم یہ ہے کہ عاشق تذبذب کا شکار ہے۔ وہ اپنے دل کی بدلتی ہوئی کیفیت کو سمجھ پانے سے قاصر ہے۔ جس

طور پر وہ کسی مخصوص مقام پر موجود تو ہوتا ہے لیکن ذہنی طور پر کسی دوسری ہی دنیا کی سیر کر رہا ہوتا ہے۔ ''بیگانہ آشنا'' یقیناً محبوب ہے، جو عاشق کو بہ یک وقت دو متضاد کیفیتوں سے دوچار کرتا ہے۔ ''آشنا'' کے ساتھ ہی ''بیگانہ'' لفظ کا استعمال کر کے شاعر نے محبوب کے دوسرے رخ کو بھی پیش کر دیا ہے۔ ہزار آشنائی کے باوجود قدم قدم پر محبوب کی ادائیں اس نوعیت کی ہوتی ہیں کہ بیگانگی کا احساس بھی بڑی شدت کے ساتھ ابھرتا ہے۔ تمام تر بے اعتنائیاں محبوب صرف اس بنا پر کرتا ہے تاکہ اس کی اداؤں میں مزید نکھار پیدا ہو سکے۔ عاشق سے اس کا تعلق بہت پرانا نہیں ہے۔ اسی بنا پر عاشق سے وہ بیگانہ نہیں لیکن ساتھ ہی پوری طرح آشنا بھی نہیں۔

لے نام آرزو کا، تو دل کو نکال لیں ㅤㅤㅤ مومنؔ نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

مومن یعنی ایمان لانے والا، مذہب اسلام کا پیروکار، جب کہ بدعتی ٹھیک اس کے متضاد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مذہب میں نیا طریقہ نکالنے والا، بڑی رسم جاری کرنے والا، فساد پھیلانے والا، وغیرہ۔ مطلب یہ کہ مومن اور بدعتی دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ جو مومن نہیں ہے وہ بدعتی ہے اس کے اندر مومن کے صفات موجود نہیں ہو سکتے۔ پہلے مصرعے میں شاعر نے عاشق کے جوش اور ولولے کا نقشہ کھینچا ہے۔ یہاں لفظ آرزو اپنے اندر معنی کی متعدد جہتیں رکھتا ہے۔ اس لفظ کے ذریعہ خواہش کے ذریعہ، خواہش تمنا، چاہ، مراد مقصد مطلب وغیرہ مفاہیم کی ترسیل ایک ساتھ ہو رہی ہے۔ ایک مومن غلط راستوں کا استعمال کبھی نہیں کر سکتا۔ جن چیزوں کا تعلق بدعت سے ہے وہ چیزیں مومن کے ذریعے انجام نہیں پا سکتیں۔ شاعر واضح طور پر کہتا ہے کہ اگر بدعتی سے ہم کوئی ربط رکھیں، بدعتی سے ہمارا کوئی تعلق ہو، تو پھر ہم مومن نہیں ہو سکے۔ مومن لفظ کا لغوی مفہوم شعر میں ندرت پیدا کر رہا ہے اور خاص بات یہ ہے کہ شاعر نے اپنے تخلص کا دو طرفہ استعمال بڑے سلیقے سے کیا ہے۔

❁❁❁

رضا فراز

مومن

مومن خان مومن اردو کے عہد زریں کے ان اہم شاعروں میں ہیں جو ایک طرف روحانی اور دینی میدان کے شہسوار تھے تو دوسری طرف عشق و محبت کی راہ میں خود کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ان کی شاعری کے مضامین مشکل ضرور تھے لیکن اہل نظر شاعروں سے دنیاوی علوم میں ان کا درک مخفی نہیں تھا۔ وہ حضرت ابراہیم ذوق اور مرزا غالب کے ہم عصروں میں تھے۔ مرزا غالب مومن کی سادگی پر اپنا پورا دیوان لٹانے کو تیار تھے۔

مومن کی پیدائش ۱۲۱۵ میں دہلی کے محلہ کوچہ چیلاں میں پیدا ہوئے، مومن کی پرورش و پرداخت ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جو دینی و علمی روایت سے وابستہ تھا اور ولی اللہی کا معتقد تھا۔ مومن کے آباء شرفائے کشمیر سے تھے اور دہلی آکر آباد ہو گئے تھے۔ خدائی پیشہ طبابت ہونے کی وجہ سے شاہی دربار میں بڑی وقعت تھی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی سے مومن کے گھرانے کی بڑی انسیت تھی، چنانچہ جب ہوش سنبھالا تو حضرت شاہ عبدالقادر کی بارگاہ میں زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ اپنا خاندانی پیشہ طباب کی تعلیم لی، اس کے ساتھ ساتھ علم نجوم اور ہیئت میں بھی کمال درک بہم پہنچائی۔ اس کے علاوہ ریاضی، موسیقی، رمل، جفر، شطرنج اور چوسر میں بھی مہارت حاصل کی تھی۔

مومن چونکہ ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے اس لیے انھوں نے اپنا دیوان ایسی غزل سے شروع کیا جس میں حمد، نعت، منقبت اور جذبہ اعلائے پرچم اسلام شامل ہے۔ ان کے دیوان کا سب سے پہلا شعر وہ ہے۔

نہ کیوں کر مطلع دیواں ہو مطلع مہر وحدت کا   کہ ہاتھ آیا ہے روشن مصرع انگشت شہادت کا

اس شعر میں انھوں نے وحدانیت کا اشارہ کیا ہے اور توحید کو پھیلانے کے لیے اپنے عزم کا

ابھی اظہار کیا ہے۔انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی ہے کہ دیوان کا یہ مطلع توحید کے سورج کا مشرق بن جائے اور اس دیوان کے ذریعے پوری دنیا میں توحید کا اجالا پھیلے۔

بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خار ماہی سے — کہ بام عرش سے پھسلا ہے یارب پاؤں دقت کا
سرشک اعتراف عجز نے الماس ریزی کی — جگر صد پارہ ہے اندیشہ خوں گشتہ طاقت کا
نہ یہ دست جنوں ہے اور نہ یہ جیب جنوں کیشاں — کہ ہو دست مژہ سے چاک پردہ چشم حیرت کا
نہ دے تیغ زباں کیوں کر شکست رنگ کو طعنے — کہ صفحائے خرد پر حملہ ہے فوج خجالت کا
غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے — نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

مومن نے اپنے دیوان کے پہلے غزل کے پہلے چھ مصرعوں میں حمد باری تعالیٰ، معرف خداوندی سے اپنے عجز کا اظہار، معرفت خداوندی کی کی شدید خواہش، اللہ جل شانہ کی جلالت کے سامنے اظہار شرمندگی، اللہ کی قہاری و جباری سے خوف و دہشت اور اس کی رضاوخوشنودی کے حصول کی چاہت کے ساتھ ساتھ اس خلوص و محبت کا کا اظہار کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے تیرے جنت کی چاہت یا دوزخ کا خوف نہیں ہے بس مجھے صرف اور صرف تیری رضا چاہیے۔

رسالت مآب ﷺ کی نعت پاک تمام شاعروں نے لکھی ہے اور آداب میں شامل ہے کہ حمد باری تعالیٰ کے بعد حضور کی مدح بیان کی جائے، چنانچہ مومن نے بھی حمد کے بعد نعت پاک کے چند اشعار لکھے ہیں۔

گلوئے خامہ میں سرمہ مداد دودۂ دل ہے — مگر لکھنا ہے وصف خاتمہ جلد رسالت کا
نہ پوچھو گرمی شوق ثنا کی آتش افروزی — بنا جاتا ہے دست عجز شعلہ شمع فکرت کا
نمک تھا کہ بخت شور فکر خوان مدح شیریں پر — کہ دندان چمع نے خوں کیا ہے دست حسرت کا

ان تینوں شعر میں مومن نے حضور کی بارگاہ میں اپنی عقیدت کا خراج کئی شکلوں میں پیش کیا۔وہ کہتے ہیں کہ قلم سے جو سیاہی نکل رہی ہے وہ میرے دل کی ناکامی کا دھواں ہے اور ناکامی سے میرا دل ڈوب چکا ہے لیکن خاتم المرسلین محمد ﷺ کی توصیف لکھنے سے میرے اس قلم اور دل کو تسکین ملے گی۔کیوں کہ حضور کی ستودہ والا صفات کی تعریف کے بغیر دل کو قرار نہیں آسکتا۔مومن حضور کی

شان میں نعت گوئی کے لیے اتنے پرشوق ہیں کہ ان دل وفور نعت سے لبریز ہوکر اب عجز کا اظہار کرنے لگا ہے۔ گویا وہ کہتے ہیں کہ یارسول اللہ آپ کی ذات بہت ہی اعلیٰ ہے میری محدود فکر آپ کی وسعت شان کا اندازہ نہیں لگا سکتی اور میری گندی زبان آپ کی ذات والا صفات کے ذکر کے قابل نہیں۔ گویا وہ مولائے روم کے اس شعر کے مصداق ثابت ہوئے ہیں۔

ہزار بار بشویم دہن زمشک وگلاب ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اس غزل کے بقیہ نعتیہ اشعار میں مومن نے اسلام کے پرچم کو بلند کرنے اور توحید کے پیغام کو عام کرنے کی خواہش ظاہر کی ہے۔ مومن چونکہ ایسے مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے جہاں ان کو ازبر کرایا گیا تھا کہ دعا کرنے سے پہلے باری تعالیٰ کی حمد وثنا اور رسول مقبول ﷺ کی نعت اور درود پڑھی جائے تو وہ رد نہیں ہوتی، اس لیے انھوں نے اپنے آنے والے شعر میں یقین کامل کے ساتھ اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اب میں اپنے رب سے کیوں نہ دعا کروں کہ یہی تو قبولیت دعا کی گھڑی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو،

خدایا ہاتھ اٹھا عرض مطلب بھا کیوں کر کہ ہے دست دعا میں گوشہ دامان اجابت کا

پرچم توحید کی سربلندی کا ایک جنوں ان کیا اندر تھا جو ان کے فروغ توحید کے زمام شوق کو مہمیز کر رہا تھا۔ چنانچہ ان کی خواہش تھی کہ دنیا میں صرف خدا کی پوجا کی جائے اور گمرہی وضلالت اس دنیا سے ختم ہو جائے۔ اس کے لیے انھوں نے سخت تیور اپناتے ہوئے دعا کی ہے کہ اے اللہ توحید کو اس قدر غالب فرما کہ جاہلیت اور گمرہی کا خرمن ہستی تباہ وبرباد ہو جائے۔ شعر ملاحظہ ہو۔

فروغ جلوہ توحید کو وہ برق جولاں کر کہ خرمن پھونک دیوے ہستی اہل ضلالت کا

مومن نے اپنی اس دعائی، حمدیہ اور نعتیہ غزل میں اللہ سے دعا کی ہے کہ مجھے پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی سیرت طیبہ پر گامزن فرما تا کہ میرا ویران دل سنت رسول سے آباد ہو جائے، مجھے توحید کی ایسی سونتی ہوئی شمشیر آبدار بنادے کہ میرا نام سن کر ہی اسلام کے بدخواہوں اور اسلام دشمن طاقتوں کے دلوں میں لرزہ طاری ہو جائے۔ مومن نے جہاد کا شوق بھی ظاہر کیا ہے، چنانچہ سید احمد شہید اور شاہ اسمٰعیل دہلوی کے ساتھ انھوں نے جہاد پر بھی جانے کی تمنا کی تھی جب یہ دونوں ہستیاں سرحدی مسلمانوں پر ظلم کرنے والے سکھوں کے خلاف جہاں کا اعلان کیا تھا

انھوں نے تمام مسلمانوں کو ایک پرچم تلے جمع ہونے کی بھی تلقین کی، چنانچہ ان کے زمانے میں شاہ اسمٰعیل دہلوی کے مرشد سید احمد شہید جن کو مومن امام بھی مانتے تھے، ان کی اقتدار اور پیروی کو اپنے لیے لازم قرار دیا تھا اور ان کی اقتدار سے انکار کرنے کو علامت کفر کا مرتکب بتایا ہے۔ چنانچہ انھوں نے خلاف کا بھی ایک تصور پیش کیا ہے۔ مومن چونکہ دینی علوم پر کام عبور رکھتے تھے اس لیے انھوں نے اپنی شاعری میں جابجا قرآن واحادیث کی بھی ترجمانی کی ہے۔ ماسبق میں پیش کیے گئے کئی اشعار میں قرآن واحادیث کے پیغامات کی جھلک ملتی ہے۔ مومن نے اپنے حمدیہ اور مدحیہ غزل میں حضور کی اس حدیث کی بھی تشریح پیش کی ہے جس میں حضور نے وصیت کی ہے کہ میری امت میں جو شخص امام مہدی کا زمانہ پائے تو اس کو میرا اسلام کہہ دے۔ امام مہدی علیہ السلام قرب قیامت میں ظاہر ہوں گے اور لوگوں کو فتنہ دجال سے نجات دلائیں گے۔ مومن کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرا جو ہر ہو سرتاباصفائے مہر پیغمبر	میرا حیرت زدہ دل آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو	دل صد پارہ اصحاب نفاق اہل بدعت کا
خدایا لشکر اسلام تک پہنچا کہ آپہنچا	لبوں پر دم بنا ہے جوش خوں شوق شہادت کا
نہ رکھ بیگانہ مہر امام اقتداء سنت	کہ انکار آشنائی کفر ہے اس کی امامت کا
اسیر لشکر اسلام کا محکوم ہوں یعنی	ارادہ ہے میرا فوج ملائک پر حکومت کا
زمانہ مہدی موعود کا پایا اگر مومن	تو سب سے پہلے تو کہیوں سلام پاک حضرت کا

مومن کے اس جداگانہ مضامین اور رنگ تغزل کی وجہ سے ہی ان کو یاد کیا جاتا ہے۔ ان کی اس قدر گہری مذہبی فکر کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ اس ن کی پرورش اور تعلیم وتربیت خاندان ولیٰی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مجلس وعظ میں انھیں بیٹھنے کا موقع ملا تھا۔ وہ کبھی کبھی دوسرے مسالک کی چٹکیاں بھی لیا کرتے تھے لیکن بزرگان دین، صوفیہ اور اہل خانقاہ سے ان محبت مسلم ہے۔

مومن ایک طرف تو مذہب اسلام کے تئیں جس جذبہ، ولولہ اور شوق کا اظہار کیا ہے اسی طرح دوسرے اشعار مںں عشق ومحبت، معشوق کی عشوہ طرازی، ناز وادا اور خود سپردگی کا ذکر کیا ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

اس کوچے کی ہوا تھی کہ میری ہی آہ تھی	کوئی تو دل کی آگ پہ پنکھا سا جھل گیا

کچھ جی گرا پڑے پر اب تو نے ناز سے مجھ گرا دیا تو میرا دل سنبھل گیا

ان اشعار میں مومن نے اپنے محبوب کی محبت میں اپنے اندرونی کیفیت کا اظہار کیا ہے۔انھوں نے محبوب کی گلی کی ہوا کو زخم پر نمک چھڑ کنے کے مترادف بتایا اور کہا کہ اس کی وجہ سے میرے سارے زخم ہرے اور تازہ ہو گئے۔ ماسبق میں مومن نے جنت کا شوق اور دوزخ کی ہولناکی کے بجائے اللہ کی رضا و خوشنودی کو اپنے لیے اولین ترجیح دی ہے لیکن مومن کا یہ شعر بھی دیکھیے

نہ جاؤں گا کا بھی جنت کو میں نہ جاؤں گا اگر نہ ہووے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا

اور یہ شعر بھی ملاحظہ کیجیے

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں رضا کی تیری خواہش ہے نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشتاق جنت کا

مومن کے اشعار میں کئی مقامات پر تضادات نظر آتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ کبھی سخت گیر مذہب پسند رہے تو کبھی دل سوختہ دل گرفتہ عاشق زار، اس لیے مومن کی شاعری میں متضاد چیزیں در آئی ہیں۔ مومن کے یہاں طنز و مزاح کا عنصر بھی جگہ جگہ غالب نظر آتا ہے، مسلکی معاملات ہوں یا حسن و عشق کا تذکرہ، ہر جگہ ان کی ظرافت کی خوشبو پھیلی ہوئی ہے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے محبوب پر بھی طنز کر دیا ہے جس نے اپنے بیمار عاشق پر بھی رحم نہیں کیا۔ شعر دیکھیے

غیر عیادت سے برا مانتے دل ایسے شوخ کو مومن نے دیدیا کہ وہ ہے
قتل کیا آن کے اچھا کیا محب حسین کا ہے اور دل رکھے شمر کا سا

مومن اپنے عشق کو کسی سے نہیں چھپاتے بلکہ اس کا برملا اظہار کرتے ہیں، عشق ان کے لیے حرز جاں ہے اور ان میں وہ خود کو فنا کر لینے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ شعر دیکھیے

دم حساب رہا روز حشر بھی یہی ذکر ہمارے عشق کا چرچا کہاں کہاں نہ ہوا

مومن یوں تو تمام صنف شاعری پر عبور رکھتے تھے، لیکن انھوں نے اظہار خیال کا ذریعہ صرف صنف غزل کو بنایا۔ انھیں کئی علوم پر کامل دستگاہ ہونے کے باوجود صرف حسن و عشق، ہجر و وصال، معشوق کی ناز برداری اور عشقیات کے ارد گرد خود کو محدود کر لیا لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں بلا کی سنجیدگی اور معنی کی گہرائی ہے۔ وہ اپنا سب کچھ لٹا کر اور خود کو فنا کر کے بھی اپنے محبوب کو خوش رکھنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ مرض الموت کے عالم میں جب تمام اقرباء انھیں کلمہ طیبہ کی تلقین کر رہے

ہیں اس وقت بھی انھیں اپنے معشوق کی یاد ستاتی ہے۔ مومن کا شعر دیکھیے

ہزار شکر کہ اس دم وہ بدگماں نہ ہوا خدا کی یاد دلاتے تھے نزع میں احباب

دبستان دہلی کے دیگر شعراء کی طرح مومن کے یہاں بھی داخلی کیفیت کا اظہار اکثر مقام پر ہوتا ہے۔ چونکہ مومن بھی دہلی میں ہونے والے اتل پتھل سے دل برداشتہ تھے اور انگریزوں کے خلاف برسرپیکار رہنے والے گروپ کے ہمنوا تھے اس لیے ان کے یہاں جذبات کی شدت کا احساس کثرت سے ہوتا ہے۔ وہ جس پایہ کے عالم تھے اگر ان تمام علوم پر اظہار خیال کرتے تو شاید ان کا شمار عظیم شاعروں میں ہوتا لیکن وہ سب کچھ چھوڑ کر صرف حسن وعشق اور محبوب کی عشوہ طرازی وناز برداری کو اختیار کیا۔ وہ اس دنیا میں صرف ۳۵۳ سال ہی زندہ رہے۔ مومن اپنے ہمعصروں میں مقبول بھی تھے اور ان کے ہمعصران کی قدر بھی کرتے تھے۔ چنانچہ جب ان کا انتقال ہوا تو غالب نے ان کی یاد اور تعریف میں رباعی بھی لکھی ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ مومن نے عشق ومحبت کے موضوعات کو بڑے نفسیاتی انداز میں پیش کیا جس میں نزاکت اور کشش ہے۔ مومن کی زندگی کی دومتضاد کیفیات کی وجہ سے ان کی شاعری میں تضاد ات ضرور آگئے ہیں لیکن مومن کے اشعار میں ان کے جذبات کی شدت اور خیال کی معنیٔ آفرینی کو بھی دیکھا اور سمجھا جاسکتا ہے۔ مومن کی شاعری پر مولانا حالی نے یادگار غالب میں لکھا ہے کہ 'نزاکت خیال میں مومن غالب سے سبقت لے گئے تھے'۔ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں مومن کی تعریف یوں کی ہے 'مومن کا علم ان کے ہمعصروں پر مسلم ہے ان کی نجوم دانی کے بہت سے واقعات مشہور ہیں'۔ مجاہد انقلاب ۱۸۵۷ علامہ فضل حق خیرآبادی کہا کرتے تھے کہ 'مومن بھیڑیا ہے اس کو اپنی قوت کی خبر نہیں، اگر وہ عشق وعاشقی کے قصے کو چھوڑ کر علمی مشغلے میں پڑتا تو اس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی'۔

✿✿✿

غالب اکیڈمی کی ادبی سرگرمیاں

22/ نومبر 2014 کو غالب اکیڈمی میں تین مجموعوں پر گفتگو:

22/ نومبر 2014 کو شام چھ بجے غالب اکیڈمی، حضرت نظام الدین، نئی دہلی میں ایک ادبی نشست کا اہتمام کیا گیا جس میں دیوناگری میں شائع ڈاکٹر جی آر کنول کی کتاب ''ریزہ ریزہ زندگی''، وقار مانوی کی کتاب ''غزل کے رنگ''، ڈاکٹر ظفر مرادآبادی کی کتاب ''میں ہوں شاعر'' پر گفتگو ہوئی جس میں شمس رمزی، سلیم صدیقی، جی آر کنول نے حصہ لیا اس موقع پر شعری نشست کا بھی اہتمام ہوا جس میں متین امروہوی، نسیم عباسی، احمد علی برقی، سکندر عاقل، رؤف رضا، شہباز ندیم ضیائی، اقبال فردوسی، ممتا کرن، جاوید مشیری، منیر ہمدم نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔

27/ دسمبر 2014 کو غالب کے 217ویں یوم ولادت کا جلسہ:

'غالب، اردو اور دہلی کا آپس میں گہرا تعلق رہا ہے۔ غالب، اردو اور دہلی نے اپنی اپنی زندگیوں میں کئی اتار چڑھاؤ دیکھے۔ غالب کی دلی ایک ایسے گلشن کی طرح تھی جس میں خزاں اور بہار کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔'' ان خیالات کا اظہار پروفیسر سلیل مسرا نے ایک خصوصی لیکچر میں کیا جس کا اہتمام غالب اکیڈمی نے یہاں اپنے آڈیٹوریم میں لافانی شاعر اور ادیب مرزا اسداللہ غالب کے 217ویں یوم ولادت کے موقعے پر کیا تھا۔ اس پروقار جلسہ سے قبل غالب کے مزار پر گل پوشی کی گئی۔

یوم ولادت کے حوالے سے منعقدہ اس جلسہ میں اپنے خطبے میں پروفیسر مسرا نے کہا کہ انیسویں صدی کی اردو ایک چراغ کے مانند تھی جس کی لو بجھنے سے پہلے تیز بھڑکتی ہے۔ ایسے ماحول نے غالب کی شاعری پر گہرا اثر ڈالا۔ غالب کی شاعری کو سمجھنے کے لیے اردو فارسی روایت اور انیسویں صدی کی دلی کو سمجھنا بہت ضروری ہے ان تینوں کا مطالعہ بہت ہی خوبصورت ہے اور اہم بھی ہے۔ انہوں نے انیسوی صدی کے حالات کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہا کہ اس دور میں تغیر پذیر واقعات کا اثر غالب کی شاعری میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔

پروفیسر گنگا پرساد بمل نے بھی اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ میر غالب

سبھی ہندوستانی زبانوں کے شاعر لگتے ہیں۔ غالب کے شعروں کو بھی حوالے کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اپنے مطلب کے مطابق ان کے شعروں کو استعمال کرتے ہیں۔

اس موقع پر غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ غالب اکیڈمی مرزا غالب کی وجہ سے معرض وجود میں آئی ہے جو غالب کے کلام کے علاوہ اردو زبان و ادب کی ترویج کا فریضہ گزشتہ 45 برسوں سے انجام دے رہی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ غالب اکیڈمی مرزا غالب کے یوم ولادت کی تقریب بڑے اہتمام سے ہر سال منعقد کرتی ہے جس میں کسی غالب شناس کو غالب کی شخصیت اور ان کے فن پر خصوصی خطبہ دینے کے لئے مدعو کیا جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اس کا سلسلہ دراز ہو گیا۔ انہوں نے کہا کہ چونکہ غالب کی شاعری میں ایک ایسا ذخیرہ ہے جس سے نت نئے نئے موضوع نکلتے رہتے ہیں اور غالب پر منعقد ہونے والی ہر تقریب میں ایک انوکھا اور نیا پہلو ضرور ہوتا ہے۔

جلسے کی صدارتی تقریر میں پروفیسر صادق نے پروفیسر سلیل مسرا کے لیکچر کی ستائش کی اور کہا کہ انھوں غالب اردو اور دلی تینوں کا حق ادا کیا۔ پروفیسر صادق نے اپنی تقریر میں خاص طور سے غالب کی فارسی مثنوی چراغ دیر کا ذکر کیا جس میں خاص طور پر بنارس اور قدیم ہندوستانی تہذیب کا تفصیلی ذکر ملتا ہے۔ اس موقع پر مدھومیتا بوس نے غالب کی غزلوں کو موسیقی کے ساتھ پیش کرکے سامعین کو محظوظ کیا۔

مرزا غالب کے 146 ویں یوم وفات اور غالب اکیڈمی کے 46 ویں یوم تاسیس کے موقع پر سہ روزہ پروگرام کا انعقاد:

مرزا غالب کا انتقال 15 رفروری 1869 کو اور غالب اکیڈمی کا افتتاح 22 رفروری 1969 کو ہوا تھا اسی مناسبت سے غالب اکیڈمی ہر سال سہ روزہ پروگرام کا انعقاد کرتی ہے۔ بروز جمعہ 20 فروری 2015 کو ایک شاندار محفل کلام غالب کا انعقاد کیا گیا، جس میں استاد محمد سلیم خاں نے کلام غالب پیش کیا اور ان کے ساتھ استاد سلامت علی نے طبلے پر اور استاد آصف علی نے سارنگی پر ساتھ دیا۔ پھر مدھومیتا بوس نے غالب کی آٹھ غزلیں پیش کرکے سامعین کو محظوظ کیا۔ اس موقع پر دہلی کی اہم علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں جن میں انجم عثمانی، نگار عظیم، پروفیسر شریف حسین قاسمی، منصور عثمانی، قیصر عزیز، نسیم عباسی، فضل بن اخلاق، حسن ضیا، شہباز ندیم ضیائی، جے ایل وارثی، بابو رام ورما، انور خان، سدھر ایڈوکیٹ وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔ اس

پروگرام کی نظامت کے فرائض صبیحہ نے ادا کیے۔

21/فروری2015 کو غالب اور نیا زمانہ کے عنوان سے کل ہند سیمینار کا انعقاد کیا گیا جس میں اندور سے ڈاکٹر ظفر محمود، علی گڑھ سے پروفیسر قاضی افضال حسین، پروفیسر قاضی جمال حسین، لدھیانہ سے وشال کھلر اور دہلی کے پروفیسر نصیر احمد خاں، پروفیسر گنگا پرساد بمل، ڈاکٹر نریش ندیم، انجم عثمانی، خالد علوی، ابوبکر عباد، حنا آفرین، واحد نظیر، عبدالسمیع، معاذ احمد، شاہ نواز ہاشمی نے مقالے پڑھے۔ سیمینار کے پہلے اجلاس کی صدارت پروفیسر قاضی افضال حسین اور ڈاکٹر جی آر کنول نے کی۔ اس اجلاس میں عبدالسمیع نے غالب کی تہذیبی شخصیت ایک مطالعہ کے عنوان سے مقالہ پیش کیا اس میں انھوں نے جیلانی کامران کی کتاب کے حوالے سے تفہیم غالب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ ڈاکٹر ابوبکر عباد نے روایت شاعری کا پہلا ترقی پسند غالب کے عنوان سے مقالہ پیش کیا انھوں نے کہا کہ غالب نے جذبات نگاری اور تعقل پسندی کو شعروادب کی شریعت میں رائج کیا اور سائنسی مزاج کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا۔ وشال کھلر نے ہر دور کے غالب کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے غالب کے اشعار کی لسانی خوبیوں کا ذکر کیا، اور کہا کہ غالب اپنی آزادخیالی کے باعث اپنے طرز اسلوب میں کھلا پن رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر خالد علوی نے غالب کے ذہنی رویہ کے عنوان سے مقالہ پڑھتے ہوئے کہا کہ خطوط غالب کے حوالے سے غالب کی ناپسندیدگیوں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنے پرچے میں شہروں کے بارے میں غالب کے رویے کا ذکر کیا۔ انجم عثمانی نے غالب اور الیکٹرانک میڈیا کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کی مقبولیت میں گلزار کی فلموں کے ساتھ ساتھ ٹی وی سیریلز اور دستاویزی فلموں نے اہم رول ادا کیا۔ پروفیسر گنگا پرساد بمل نے کہا کہ غالب کے زیادہ تر شعروں میں سوال ملتے ہیں۔ غالب کی پوری غزلوں کا ترجمہ کرنا ممکن نہیں ہے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین نے غالب اور جدید ذہن کے عنوان سے مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ غالب نے انسانی وجود اور مظاہرے کو مسلمات کی روشنی دیکھنے کے بجائے نئے زاویوں سے الٹ پلٹ کر دیکھا ہے اور فکر و خیال کے نادیدہ جہان دریافت کیے ہیں۔ جدید ذہن نے بلاشبہ کلام غالب کے اسرار کو کھولنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

لیکن مستقبل کا جدید ذہن کلام غالب کے مزید نئے امکانات دریافت کرے گا۔ ڈاکٹر نریش ندیم نے اپنے مقالے کلام غالب میں فلسفے کے عناصر میں کہا کہ جب تک یہ دنیا ہے ایک جیتی جاگتی حقیقت ہے۔ اسے مایا یا واہمہ قرار نہیں دیا جاسکتا اور نہ اس کے ہونے سے انکار کیا جاسکتا ہے۔ غالب کا قول ہے کہ ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا عین اسی سیاق میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ڈاکٹر ظفر محمود نے اپنے مقالے دور حاضر میں کلام غالب کی معنویت میں کہا کہ مرزا غالب کی معنویت واہمیت اور ان کی عظمت وآفاقیت اس لیے ہے کہ وہ فکر واسلوب کے لحاظ سے ایک بے حد منفرد شاعر ہیں ان کی شاعری میں زندگی کا ایک نیا تصور ملتا ہے۔ پروفیسر قاضی افضال حسین نے غالب اور ہمارا عہد کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ غالب کی تخلیقی سرشت نے غالباً بالکل غیر شعوری طور پر تشکیل متن کا طریقہ اختیار کیا جس میں زبان موجود کی ترجمانی کے بجائے خود اپنی ماہیت اور طریقۂ کار کی ترجمانی ہوجاتی ہے۔ اس لیے ہمارے زمانے کی لسانی مرکزی فکر کے اس نئے تناظر میں کلام غالب کی معنویت کے نئے جہات روشن ہونے کا امکان بڑھ گیا ہے۔ پہلے اجلاس کی نظامت ابوظہیر ربانی نے کی۔

دوسرے اجلاس کی صدارت پروفیسر نصیر احمد خاں اور عارف نقوی نے کی۔ اس اجلاس میں شاہ نواز ہاشمی، معاذ احمد، حنا آفرین اور واحد نظیر نے مقالے پیش کیے، شاہ نواز ہاشمی نے اپنے مقالے ہوتا ہے شب وروز میں کہا کہ غالب کی زندگی سے محبت اور انسان دوستی کا احساس ہمیں ان کے اشعار میں واضح طور پر نظر آتا ہے۔ معاذ احمد نے غالب کا ایک شعر ایک مطالعہ کے عنوان سے اپنے مقالے میں کہا کہ مدعا عنقا ہے اپنی عالم تقریر کا غالب کے فلسفے کی شعری زبان ہے۔ ڈاکٹر واحد نظیر نے اپنے مقالے عہد حاضر میں غالب کی معنویت میں کہا کہ موضوع فکر اور زبان ہر سطح پر موجودہ عہد میں غالب کی معنویت کے پہلو نہ صرف روشن ہیں بلکہ کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو از سر نو غور وفکر کی دعوت دیتے ہیں۔ ڈاکٹر حنا آفرین نے اپنے مقالے غالب اور نئی غزل کی روایت میں کہا کہ نئی غزل کی روایت کی جڑیں تلاش کرتے ہوئے ہم غالب کی شاعری میں بہت کچھ دریافت کرسکتے ہیں۔ جو موضوعات وسائل نئی غزل کی پہچان ہیں۔ ان کی بنیادیں وہاں موجود ہیں

اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ نئی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے کہا ہم غالب کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ پروفیسر نصیر احمد خان نے اپنی صدارتی تقریر میں غالب کی لسانی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ غالب کی عظمت کو سب تسلیم کرتے ہیں لیکن انھیں وہ مقام نہیں ملا جس کے وہ حقدار تھے۔ جرمنی سے آئے عارف نقوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ یوروپ میں غالب پر کام ہو رہا ہے جرمنی میں اردو کے ماہانہ جلسے ہوتے ہیں۔ یوروپ میں ہو رہی اردو سرگرمیوں اور ہندوستان میں ہونے والی ادبی وثقافتی سرگرمیوں میں آپسی تال میل ہونے سے اردو کے فروغ میں بڑا کام ہو سکتا ہے۔

تیسرے دن 22/فروری کو غالب کی زمین میں طرحی مشاعرے کا انعقاد ہوا۔اس بار طرحی مشاعرے کے تین مصرعوں 1۔بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے۔2۔یک ذرۂ زمیں نہیں بیکار باغ کا۔3۔بالا سے ہیں جو یہ پیشِ نظر در و دیوار پر تقریباً تیس شعرا نے اپنے کلام سے سامعین کو محظوظ کیا۔ مشاعرے کا افتتاح بستی حضرت نظام الدین علاقے کے ایم ایل اے جناب پروین کمار نے شمع روشن کر کے کیا اس موقع پر انھوں نے کہا کہ اردو کے مسائل پر نئی حکومت جلد ہی حکمت عملی بنائے گی اور اسکولوں میں اردو تعلیم کا بندوبست کرے گی۔گلزار دہلوی نے مشاعرے کی صدارت کی، نظامت کے فرائض فاروق ارگلی نے ادا کیے، کچھ اشعار پیش خدمت ہیں۔

میں نے کبھی اپنے لئے کچھ بھی نہیں مانگا
شرمندہ رہی خواہش دنیا مرے آگے (نسیم عباسی)

مایوس اجل کے بھی فرشتے ہیں سراسر
بیٹھا ہے کوئی رشک مسیحا مرے آگے (گلزار دہلوی)

اردو ہے سب زبانوں سے میٹھی زباں وقار
کانٹا بھی ہے ہرا بھرا اردو کے باغ کا (وقار مانوی)

دائم ہے وفا میری کنول دیر و حرم سے
کیا سوچ کے آتا ہے کلیسا مرے آگے (جی آر کنول)

یہ کعبہ عرشِ معلیٰ تک اک عمارت ہے
کہ اس میں ہیں در و دیوار پر در و دیوار (متین امروہوی)

اظہار کیجیے سخن باغ باغ کا
کم کچھ تو ہو اثر غم کے ایاغ کا (ابرار کرت پوری)

ذرا ذرا میں مری بات کاٹ دیتے ہیں
لگے ہوئے ہیں ترے کام پر در و دیوار (رؤف رضا)

چرچا تھا پورے شہر میں جس کے دماغ کا
ہر شخص فکرمند ہے اب اس کے سراغ کا (تابش مہدی)

ہر وقت جو سائے کی طرح تھا مرے پیچھے
کرتا ہے وہی خون تمنا مرے آگے (احمد علی برقی)

ہے جابجا اجالا محبت کے داغ کا
لائے کوئی جواب ذرا اس چراغ کا (احمد محفوظ)

کس شوق سے مصروف نظارہ تھا میں شہپر
کس ناز سے بہتا تھا وہ دریا مرے آگے (شہپر رسول)

یہ طرفہ ستم مجھ پہ زبیر اس نے کیا ہے
دشمن سے مرے ہاتھ ملایا مرے آگے (زبیر ابن سیفی)

اک عمر گزاری ہے بڑی شان سے جس نے
لاچار پڑا ہے وہی تنہا مرے آگے (ممتا کرن)

روشن ہے دیا فکر علاء دین کا مجھ میں
آئے تو کوئی آندھی کا جھونکا میرے آگے (اسلم بقائی)

عجیب شب تھی اے شاہین ساتھ ساتھ مرے
فلک کو تکتے رہے رات بھر در و دیوار (سلمیٰ شاہین)

اس عاشقی میں عزت سادات بھی گئی
کہتے ہیں جس کو عشق خلل ہے دماغ کا (عفت نذیر)

ان کے علاوہ شہباز ندیم ضیائی، شمس رمزی، جاوید مشیری، کمال جعفری، سکندر عاقل نے بھی کلام پیش کیے۔ آخر میں ڈاکٹر عقیل احمد نے شکریہ ادا کیا۔

قومی کونسل کے تعاون سے غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام مومن خان مومن پر سیمینار:

غالب اکیڈمی کے زیر اہتمام 'شرح دیوان مومن' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ سیمینار اور ورک شاپ 24/مارچ2015 کو منعقد کی گئی جس میں ممتاز ادبی شخصیات اور مقالہ نگاروں نے کیا۔ نامور ناقد پروفیسر شمیم حنفی نے کہا کہ غالب پر بہت زیادہ کام ہوا لیکن ان کے معاصرین، مومن، شاہ نصیر، ذوق اور بہادر شاہ ظفر پر اتنی توجہ نہیں دی جس کے وہ مستحق ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مومن کی غزل کا کوئی جواب اردو شاعری میں نہیں ہے۔ اور ان کی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں جس میں ان کے دور کی سیاسی تبدیلیوں کا اثر بھی نظر آتا۔ شمیم حنفی نے کہا کہ مومن کی شخصیت بڑی دلآویز تھی اور طب، نجوم، فلکیات ریاضی اور دیگر علوم کے بھی ماہر تھے۔ انہوں نے کہا کہ غالب کی طرح مومن کے مطالعہ پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اپنی صدارتی تقریر میں پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ مومن صرف اردو کے شاعر نہیں ہیں بلکہ وہ فارسی کے بھی عظیم شاعر ہیں اور انیسویں صدی کے سب سے بڑے اور ممتاز فارسی شاعر ہیں۔ ان کی فارسی شاعری میں جو روانی ہے وہ اردو میں دکھائی نہیں دیتی۔ انہوں نے یہ مشورہ دیا کہ اردو کے ہر شاعر کا موازنہ غالب سے نہ کیا جائے یہ اس شاعر کے ساتھ زیادتی ہے۔

ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ مومن اردو کے واحد شاعر ہیں جن کا تذکرہ علامہ اقبال نے کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ مومن کی پرورش ایک مذہبی خاندان میں ہوئی تھی اور شاہ ولی اللہ دہلوی

کے دوسرے صاحبزادے شاہ عبدالقادر سے نسبت رکھتے تھے اسی لئے ان کی شاعری میں انگریزی استعماریت کے خلاف بھی آواز نظر آتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے مومن کی 'مثنوی جہاد' کا حوالہ پیش کیا۔ مومن کے کلام کا نئے زاویہ سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔

ماہرلسانیات پروفیسر نصیر احمد خان نے کہا کہ اردو کی چھ سو سالہ اردو شاعری میں 12 اسالیب استعمال ہوئے ہیں اور مومن خان مون نے دقت پسند گوئی اسلوب اختیار کیا۔ اس کی وجہ ان کے بقول مومن کا خاندانی پس منظر تھا۔ اپنی شاعری میں مومن نے عربی فارسی کی رائج اصطلاحیں استعمال کیں اور کچھ اصطلاحات اور تراکیب اختراع کیں۔ وہ خواص کے شاعر تھے۔ پروفیسر نصیر احمد خان نے مومن کے اسلوب پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ان کی شاعری میں عربی اور فارسی الفاظ کی بھرمار ہے۔ مومن نے ہم صوت الفاظ کو نئے سیاق میں لاکر نئے معنی پیدا کئے۔

مشور افسانہ نگار انجم عثمانی، ، نسیم عباسی، ریاض قدوائی، ڈاکٹر حنا آفرین، ڈاکٹر واحد نظیر، نثار عالم اور دہلی یونی ورسٹی کے ریسرچ اسکالر محمد رضا فراز اور عینین علی حق نے مومن کی غزلوں کی شرحیں پیش کیں۔ سیمینار کی نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے پروفیسر ابوبکر عباد نے کہا کہ مومن اردو کی عشقیہ شاعری کے امام ہیں۔ انہوں نے جو کلاسیکی سرمایہ چھوڑا ہے اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہے۔ اپنے افتتاحی کلمات میں غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ اس سیمینار کا مقصد مومن کی ایک نئی شرح تیار کرنا ہے۔ انہوں نے کہا کہ غالب اکیڈمی غالب کے علاوہ دیگر شعرا اور ادیبوں کی طرف بھی توجہ دیتی ہے آج یہ سیمینار اور ورک شاپ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ آخر میں انہوں نے مقررین، مقالہ نگاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا جس میں طلبا کے علاوہ اہل علم کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ اس موقع پر متین امروہوی نے مومن کی زمین میں دو غزلیں پیش کیں۔

غالب اکیڈمی میں 11/ اپریل کو ماہانہ ادبی نشست:

غالب اکیڈمی ہر مہینے کے دوسرے ہفتے کو ایک ادبی نشست کا اہتمام کرتی ہے۔ 11/ اپریل 2015 کی نشست میں رخشندہ روحی کی کتاب "مگر ایک شاخ نہال غم پر" انجم عثمانی، سہیل انجم نے اظہار خیال کیا اور رخشندہ روحی نے افسانہ پیش کیا اس موقع پر متین امروہوی، نسیم عباسی، شہباز ندیم ضیائی، احمد علی برقی نے اپنے کلام سے نوازا۔ صدارت کے فرائض پروفیسر نصیر احمد خاں نے انجام دیے۔

✿✿✿

خراجِ عقیدت

غالب اکیڈمی میں سید حامد کے انتقال پر ملال پر 29 دسمبر 2014 کو تعزیتی میٹنگ:

سید حامد کے انتقال پر ملال پر غالب اکیڈمی، نئی دہلی میں ایک تعزیتی میٹنگ ہوئی جس میں ڈاکٹر عزیز احمد صدیقی نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ تیس پینتیس سال سے ہمدرد سے وابستہ تھے۔ انھوں نے ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے اہم ادارے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے رابعہ گرلس پبلک اسکول، ہمدرد پبلک اسکول، ہمدرد اسٹڈی سرکل کے فروغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جس سے ملک وملت خاص کر دہلی میں تعلیمی رجحان پیدا ہوا۔

اس موقع پر ہمدرد نیشنل فاؤنڈیشن کے سکریٹری جناب جاوید نسیم صاحب اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ حکیم عبدالحمید مرحوم کے ساتھ ہمدرد یونیورسٹی کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے میں سید حامد صاحب نے اہم رول ادا کیا۔ حکیم صاحب کے انتقال کے بعد سید حامد صاحب چانسلر مقرر ہوئے بحیثیت چانسلر انھوں نے یونیورسٹی کو اے گریڈ یونیورسٹی بنانے اور یونیورسٹی کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کا کام کیا۔ وہ پندرہ سال تک ہمدرد یونیورسٹی کے چانسلر رہے۔ ان کے انتقال سے ہمدرد کے اداروں کا جو نقصان ہوا اس کو پر کرنا مشکل ہے۔ ان کے انتقال سے ہمدرد ہی نہیں ملک کا بے حد نقصان ہوا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سید حامد صاحب نے تعلیمی میدان میں جو کام کیا وہ نا قابل فراموش ہے۔ وہ اردو کے ایک اچھے ادیب اور شاعر تھے ان کی کتاب نگار خانہ رقصاں کی تحریر مثالی نثر کا نمونہ ہے۔ ان کے انتقال سے اردو کا بہت بڑا نقصان ہوا ہے۔ آخر میں ان کے مغفرت کے لیے دعا کی گئی۔

خواجہ حسن ثانی نظامی کے انتقال پر ملال پر تعزیت کا اظہار:

غالب اکیڈمی کے سابق خواجہ صدر حسن ثانی نظامی صاحب کا 15/ مارچ 2015 کو رات سوا تین بجے انتقال ہوگیا۔ انھوں نے ایک طریل عرصے سے غالب اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے رکن کی حیثیت سے اور دس سال تک 2000 سے 2010 تک صدر کی حیثیت سے خدمات انجام

دیں تھیں۔ تصوف ان کا خاص موضوع تھا۔ جس پر انھوں نے کئی کتابیں تصنیف کیں۔ غالب سے انھیں خاص لگاؤ تھا۔ دہلی کی تہذیبی زندگی کے وہ خاص نمائندہ تھے۔ ان کے انتقال سے اردو، دہلی اور چشتیہ نظامیہ سلسلے اور غالب اکیڈمی کو نقصان پہنچا ہے اس کی تلافی ممکن نہیں۔ گورننگ کونسل خواجہ حسن ثانی نظامی کے انتقال پر ملال پر تعزیت کا اظہار کرتی ہے دعا ہے کہ اللہ انھیں جنت الفردوس عطا فرمائیں اور ان کے پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

حکیم عبدالحمید کے صاحبزادے عبدالمعید صاحب کا انتقال، جامعہ ہمدرد کے احاطہ میں سپردخاک:

ہمدرد دواخانہ کے چیف متولی اور غالب اکیڈمی کے فعال رکن جناب عبدالمعید صاحب 19/مارچ 2015 کو اس دنیا سے رحلت فرما گئے۔ انھوں نے اپنے والد ماجد حکیم عبدالحمید کی وراثت کو نہ صرف سنبھالا بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا اور اس کے ذریعے ملک وقوم کی خدمات کیں وہ ناقابل فراموش ہیں۔ آپ طویل مدت تک غالب اکیڈمی کی گورننگ کونسل کے رکن کی حیثیت سے غالب اکیڈمی کی سرپرستی فرمائی۔ آپ کی کوششوں سے غالب اکیڈمی خود کفیل بن گئی، آپ کے انتقال سے غالب اکیڈمی کا زبردست نقصان ہوا ہے۔ گورننگ کونسل جناب عبدالمعید صاحب کے انتقال پر ملال پر رنج وغم کا اظہار کرتی ہے اور دعا کرتی ہے کہ اللہ انھیں جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے لواحقین کو اور ہم سب کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ آمین

جی ڈی چندن کی موت پر آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کا تعزیتی جلسہ:

جی ڈی چندن اردو زبان اور صحافت کے عاشق زار تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی اردو صحافت کے بال و پر سنوارنے اس اس کی تاریخ وتدوین پر خرچ کی۔ کسی ستائش اور صلے پر وا کئے بغیر وہ اپنے کام میں لگے رہے اور انہوں نے اپنی بیش بہا خدمات کا کوئی معاوضہ طلب نہیں کیا۔ ان خیالات کا اظہار آج یہاں مقررین نے ایک تعزیتی جلسے کے دوران غالب اکیڈمی میں کیا۔ آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کی طرف سے منعقدہ اس جلسے کی صدارت کرتے ہوئے سابق ممبر پارلیمنٹ دسغیرم۔ افضل نے کہا کہ جی ڈی چندن نے اردو صحافت کی تحقیق میں قائدانہ کردار ادا کیا

ہے وہ اردو زبان اور صحافت کے حقیقی خیر خواہ تھے اور ان دونوں کو ترقی کی معراج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ اس موقع پر سینئر صحافی احمد مصطفیٰ صدیقی راہی نے جی ڈی چندن سے اپنے طویل تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ انتہائی سیکولر ذہن انسان تھے اور انہوں نے نہایت با اصول زندگی گزاری۔ کمشنر برائے اقلیتی لسانیات پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ وہ سانچے اب ٹوٹ گئے ہیں جس میں اپنی زبان اور تہذیب سے ایسی سچی محبت کرنے والے ڈھلا کرتے تھے۔ جی ڈی چندن کے انتقال سے ہمارے درمیان اردو صحافت کا ایک وکیل، ایک مورخ اور ایک محافظ چلا گیا ہے۔ سینئر صحافی معصوم مراد آبادی نے تعزیتی جلسے کی نظامت کرتے ہوئے کہا کہ جی ڈی چندن نے اردو صحافت کی تحقیق اور تدوین کا کام جس محنت اور جفاکشی کے ساتھ کیا ہے، اس کی اب کوئی مثال موجود نہیں ہے۔ انہوں نے اردو صحافت کے نئے گوشوں کو دنیا سے روشناس کرایا اور آزادی کے بعد اردو اخبارات اور اس کے قارئین کا ایک مستقل گوشوارہ تیار کیا۔ حسن ضیاء نے اس موقع پر کہا کہ جی ڈی چندن کو اردو زبان اور صحافت سے بے پناہ دلچسپی تھی اور انہوں نے کسی ڈگری یا لالچ کے تحت نہیں بلکہ علم و ادب کی خدمت کے لازوال جذبے کے تحت کام کیا۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے کہا کہ سرکاری ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انہوں نے جو سرگرم زندگی گزاری وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ اردو صحافت کا کینوس وسیع کرنا چاہتے تھے۔ جی ڈی چندن کے صاحبزادے ریٹائرڈ آئی اے ایس آفیسر انل لکھینا نے کہا کہ ان کے والد ایک انتہائی با اصول اور وقت کے پابند انسان تھے۔ انہوں نے اردو کے سیکولر کردار کی ہمیشہ وکالت کی۔ اس موقع پر انجم عثمانی، عبدالباری مسعود، سہیل انجم، رمیش گوتم اور متین امروہوی نے بھی اظہار خیال کیا۔ تعزیتی جلسہ میں سنیئر صحافی مودود صدیقی، ڈاکٹر ابرار رحمانی، جاوید قمر، شمع افروز زیدی، ظفر انور، ڈاکٹر سید احمد خاں، نگار عظیم، ترنم جہاں، ریاض قدوائی اور شہباز ندیم ضیائی سمیت بڑی تعداد میں علم و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگ اور صحافی موجود تھے۔

✿✿✿